سلسلۂ درسیاتِ اقبال

جلد اوّل ۔ دوم ۔ سوم

مرتّبہ
پروفیسر سیّد عبدالرشید فاضل

اقبال اکادمی پاکستان

سلسلۂ درسیاتِ اقبال

جلد اوّل ۔ دوم ۔ سوم

اوّل

مرتّبہ
پروفیسر سیّد عبدالرشید فاضل

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر: پروفیسر شہرت بخاری
ڈائرکٹر اقبال اکادمی پاکستان لاہور

طبع اوّل: ۱۹۷۳

طبع ثانی: ۱۹۹۰

مطبع: لائٹ ہاؤس پریس ۱۲ ایبٹ روڈ لاہور

تعداد: ۱۰۰۰

قیمت ۹۰ روپے

نگران طباعت : فرخ دانیال

سیلز آفس: اقبال اکادمی پاکستان؛ ۱۱۶۔ میکلوڈ روڈ لاہور

فہرست مضامین

۱۔	مختصر حالات	۱
۲۔	بچے کی دُعا	۳
۳۔	ہمارے نبیؐ	۵
۴۔	ترانہ	۵
۵۔	ایک مکڑا اور مکھی	۱۱
۶۔	ایک پرندہ اور جگنو	۱۵
۷۔	ایک پرندہ جو پیاس سے بیتاب تھا۔	۱۸
۸۔	خلیفہ ہارون رشید اور امام مالکؒ	۲۰
۹۔	ہمدردی	۲۲
۱۰۔	سیرِ فلک	۲۴
۱۱۔	ایک آرزو	۲۶
۱۲۔	شکوہ اور جوابِ شکوہ سے انتخاب	۳۰
۱۳۔	باز اپنے بچے کو نصیحت کرتا ہے	۳۶
۱۴۔	طفلِ شیر خوار (دودھ پیتا بچہ)	۳۹
۱۵۔	مذہب	۴۲
۱۶۔	کافر و مومن	۴۴
۱۷۔	محرابِ گُل۔ افغان کے افکار	۴۶
۱۸۔	اقبال اور اُن کے استاد	۵۰
۱۹۔	اقبال کے لطائف (ہنسنے ہنسانے کی باتیں)	۵۴
۲۰۔	شاہد اور عزیز کے درمیان گفتگو	۵۶
۲۱۔	اقبال کے خاص خاص اشعار	۶۰

۱۔ مختصر حالات

اقبال کا پورا نام شیخ محمد اقبال ہے اور اُن کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا اُن کی تعلیمات کی وجہ سے قوم نے انہیں حکیم الامّت کا خطاب دیا۔

اقبال ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔

اقبال نے ایف۔ اے تک، اسکاچ مشن کالج، سیالکوٹ میں تعلیم پائی۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانات گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیے۔

اقبال ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور ۱۹۰۸ء میں تعلیم مکمل کر کے واپس آگئے۔ لندن میں کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفے کا امتحان پاس کیا۔ جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد پھر لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

اقبال نے اسلامی موضوعات پر سات لیکچر دیئے جو بہت پسند کیے گئے۔ اور علامہ اقبال بطورِ مفکر اور فلسفیٔ اسلام کے مشہور ہوئے۔

آپ بہت بڑے شاعر اور اعلیٰ درجے کے فلسفی تھے۔ ان کا انتقال لاہور میں ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا۔

۱۔ نیچے لکھے ہوئے جملوں میں خالی جگہ کو پُر کرو۔ اور ان دو لفظوں سے کام لو۔

(الف) اقبال بہت بڑے ..... تھے۔

(ب) اقبال اعلیٰ درجے کے ..... تھے (شاعر۔ فلسفی)

(ج) اقبال ..... تھے

۲۔ نیچے لکھے ہوئے جملوں کو اپنی کاپی میں صاف صاف اور خوشخط نقل کرو۔

(الف) اقبال کو علم حاصل کرنے کا بہت زیادہ شوق تھا۔

(ب) اقبال روزانہ فجر کی نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

(ج) اقبال اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

۲- بچے کی دُعا

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنّا میری — زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دُور دُنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے — ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب! — علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب!
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا — دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
مرے اللہ! بُرائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

نظم کا مطلب :-

بچہ خدا سے دُعا کرتا ہے کہ :-

اے خدا میری زندگی شمع کی طرح ہو۔ جس طرح شمع کی روشنی سے اندھیرا دُور ہوتا ہے اسی طرح میرے علم کی روشنی سے دُنیا سے بُرائی کا اندھیرا دُور ہو۔ اور ہر جگہ نیکی اور بھلائی کا اُجالا ہو جائے۔

یہ بھی تمنا ہے کہ جس طرح پھول سے باغ کی رونق ہوتی ہے اسی طرح میرے دم سے میرے وطن کی رونق ہو۔ تیسری تمنا یہ ہے کہ اے اللہ! میری زندگی پروانے کی طرح ہو۔ جس طرح پروانے کو شمع سے محبت ہوتی ہے کہ جہاں شمع روشن ہوتی ہے پروانہ وہیں پہنچ جاتا ہے، میں بھی جہاں علم ہو وہیں پہنچ کر علم حاصل کروں۔

یہ بھی تمنّا ہے کہ غریبوں کی مدد کرنا اور کمزوروں اور دردمندوں سے محبت کرنا میرا کام ہو

آخر میں بچہ یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ ! مجھے بُرائی سے بچاتے رہنا اور اس راستے پر چلانا جو میرے لیے بھلائی کا راستہ ہو

۱۔ بچّے کی دُعا کو زبانی یاد کرو۔

۲۔ نیچے دیئے ہوئے الفاظ کے معنی یاد کرو۔

لفظ	معنی	لفظ	معنی
تمنّا	خواہش	ضعیف	کمزور
صورت	شکل، طرح	دردمند	
زینت	رونق		رحم دل۔

۳۔ اُوپر دیئے ہوئے لفظوں میں سے ہر ایک کو جملے میں استعمال کرو۔

۴۔ نیچے لکھے ہوئے شعر کو اپنی کاپی میں صاف صاف اور خوشخط نقل کرو۔

مِرے اللہ ! بَرائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو، اُس رہ پہ چلانا مجھ کو

۵۔ نیچے کے جملوں میں خالی جگہ پُر کرو۔

(الف) بُرائی سے بچنا . . . . ہے

(ب) میرے دَم سے دنیا کا اندھیرا . . . . ہو جائے۔

(ج) میرا کام غریبوں اور ضعیفوں کی . . . . کرنا ہو۔

۳۔ ہمارے نبی

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم ہمارے نبیؐ ہیں۔ ہر مسلمان کے دل میں، آپ کی محبت اور انتہا درجے کی عزت ہے۔ مسلمانوں کی عزت و آبرو آپ ہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے میں ہے۔

ہمارے نبیؐ ٹاٹ پر سوتے تھے اور آپؐ کی اُمت کے قدموں تلے کسریٰ کا تخت تھا مسلمانوں نے جب سے ایران کو فتح کیا ہے اس وقت سے آج تک ایران کا تخت ان کے قدموں میں ہے یعنی ایران پر مسلمانوں کی حکومت ہے۔ یہ بات مسلمانوں کو حضورؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے ہی سے حاصل ہوئی ہے۔

ہمارے نبیؐ "غارِ حرا" میں تنہا خدا کی عبادت کیا کرتے تھے مگر جب غار سے نکل کر لوگوں کو ہدایت کی تو اس کے نتیجے میں ایک قوم بن گئی، اور حکومت قائم ہو گئی اور اس قوم کو آئین مِل گیا۔ آپؐ راتوں کو خدا کی یاد میں جاگے ہیں تب سے یہ قوم تخت شاہی پر سوئی ہے یعنی مسلمان بادشاہ ہوئے اور صدیوں تک اس حالت میں سوئے کہ تخت و تاج کے مالک تھے۔ آپؐ کی شجاعت کا یہ حال تھا کہ لڑائی کے وقت آپؐ کی تلوار لوہے کے بھی ٹکڑے اڑا دیتی تھی اور آپؐ کی نرم دلی کا یہ حال تھا کہ نماز میں آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری رہتے تھے۔

ہمارے نبیؐ نے یہ تعلیم دی کہ دین کے ذریعے دنیا کی زندگی کو کس طرح خوش گوار بنایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انسان کی پوری زندگی کی رہنمائی کی اور یہ بتا دیا کہ اگر تم مومن رہو گے تو تم ہی دنیا میں اعلیٰ رہو گے چنانچہ مسلمانوں نے اسلام کی تعلیمات پر عمل کر کے آدھی سے زیادہ دنیا پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور جہاں قبضہ کیا

حکومت کا ایسا اچھا انتظام کیا کہ وہاں کے رہنے والوں کو یہ محسوس ہوا کہ گویا وہ دوزخ سے نکل کر جنت میں آگئے۔ ظاہر ہے یہ کام کوئی دوسرا نہ کر سکا اس لیے اقبال نے سچ کہا ہے کہ آپ جیسا دنیا میں پیدا نہ ہوا۔

ہمارے نبیؐ کے نزدیک پست و بلند اور ادنیٰ و اعلیٰ سب برابر تھے۔ آپؐ اپنے آزاد کیے ہوئے غلام کے ساتھ ایک دسترخوان پہ کھانا کھاتے تھے۔

مکّہ فتح ہوا تو آپؐ نے اپنے بدترین دشمنوں کو معاف کر دیا۔ کافروں نے حضورؐ کو بڑی تکلیف دی تھی مگر مکّہ فتح کرنے کے بعد جب آپؐ کو بدلہ لینے کا حق بھی تھا۔ اور قوت بھی حاصل تھی آپؐ نے فرمایا کہ تم سب کو معاف کر دیا گیا۔ آج تم کو کسی قسم کی سزا نہیں۔

۱۔ اوپر کا مضمون اقبال کی کتاب "اسرار خودی" سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ ہم نے اس کے خاص خاص حصّوں کو اُردو میں ترجمہ کر لیا ہے۔

فارسی زبان میں اسرار خودی اقبال کی پہلی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں اقبال نے خودی کو پہچاننے کی تعلیم دی ہے۔ بہت سے لوگ خودی کا نام سُن کر چونک پڑے کیونکہ خودی کے ایک معنی غرور کے بھی ہیں۔ حالانکہ اقبال نے یہ بتایا ہے کہ اپنے آپ کو جان لینا خودی کو پہچاننا ہے۔

آپ لوگ کہیں گے یہ کوئی خاص بات نہیں ہے، ہر انسان اپنے آپ کو خوب جانتا ہے۔ مگر یہ جاننا، جاننا نہیں۔ اصل جاننا تو یہ ہے کہ انسان کو خدا نے جو طاقتیں بخشی ہیں وہ ان سب سے اچھی طرح واقف ہو جائے۔ شیر جب تک شکار پر حملہ نہ کرے وہ نہیں جانتا کہ اس میں کتنی قوت ہے۔ اسی طرح انسان جب تک دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرتا ہے اس کی خودی دبی رہتی ہے۔ مگر جب کوئی سہارا نہیں رہتا اور اُسے اپنی قوت اور طاقت سے کام لینا پڑتا ہے تو اس کی خودی اُبھرتی ہے اور آہستہ آہستہ وہ سمجھ لیتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے سب میرے ہی لیے ہے۔ میں اپنی ذاتی قوتوں کو

کام میں لاؤں تو مشکل سے مشکل کام بھی کر سکتا ہوں، اور وہ کون سی چیز ہے جو اپنی کوشش اور محنت سے حاصل نہیں کر سکتا۔

اگلے زمانے کے بہت سے شاعروں نے اس بات کو نہیں سمجھا بلکہ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ انسان کو اپنی خودی بالکل مٹا دینی چاہیئے۔ اس قسم کے خیالات سب سے پہلے یونان میں پیدا ہوئے اور جب یونان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا تو بہت سے مسلمان شاعر بھی یہ باتیں نئے نئے طریقوں سے بیان کرنے لگے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ انسان کو ہاتھ پیر ہلانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اُسے خدا پر بھروسہ کر کے ایک کونے میں بیٹھ رہنا چاہیئے۔ اس قسم کے خیالات نے مسلمانوں کے بازوؤں کو سست اور ان کی تلواروں کو کُند کر دیا اور انہیں اپنے آپ پر بالکل بھروسہ نہ رہا۔ اقبال نے اسرارِ خودی میں ایسے شاعروں کی سخت مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہنا قوم کے لیے موت کا پیغام ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ اپنے آپ کو پہچانو، اپنے دل سے ڈر اور خوف بالکل نکال دو۔ دریاؤں میں کود پڑو۔ موجوں سے لڑو۔ چٹانوں سے ٹکرا جاؤ۔ کیونکہ زندگی پھولوں کی سیج نہیں جنگ کا میدان ہے

مشق

۱۔ اپنے نبیؐ کا نام بار بار پڑھ کے زبانی یاد کر لو۔ پورا نام اس طرح یاد کرو "حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم"

۲۔ "غارِ حرا" مکہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک غار ہے جس کو "غارِ حرا" کہتے ہیں ہمارے نبیؐ اس غار میں مہینوں قیام فرماتے اور خدا کی عبادت میں مصروف رہتے۔ کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے، وہ سامان ختم ہو چکتا تو گھر تشریف لے آتے اور پھر واپس جا کر خدا کی عبادت میں مصروف ہو جاتے۔

۳۔ ہمارے نبیؐ اپنے آزاد کیے ہوئے غلام حضرت زیدؓ کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا کرتے تھے اس طرح آپؐ نے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام کے نزدیک آقا و غلام کوئی چیز نہیں ہے۔

۴ - رمضان ۸ھ مطابق جنوری ۶۳۰ء میں مکہ فتح ہوا۔ اسلام کا لشکر جب مکّے کی طرف بڑھا تو مسلمان سپاہی ہتھیاروں سے سجے ہوئے تھے۔ اور تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے تو دشمن پر خوف طاری ہو گیا۔ حضورؐ نے اُن سے پوچھا "تم کو معلوم ہے میں تمہارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں؟" سب پکار اُٹھے "تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ"، حضورؐ نے فرمایا "آج تم پر کوئی الزام نہیں۔ تم سب آزاد ہو"، اس طرح ہمارے نبیؐ نے اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف کر دیا۔ یہ آپ کی شانِ رحمت تھی۔ آپ رحمۃٌ للعالمین ہیں۔

مشق

۱۔ نیچے لکھے ہوئے جملوں میں خالی جگہ کو پر کرو۔

(الف) ہمارے نبیؐ کا نام . . . . . ہے

(ب) حضورؐ جب نماز میں ہوتے تھے تو . . . . . آنسو بہتے رہتے تھے۔

(ج) ہمارے نبیؐ . . . . . میں تنہا، خدا کی . . . . . کیا کرتے تھے۔

.....

۲۔ نیچے لکھے ہوئے جملوں کو اپنی کاپی میں صاف صاف اور خوشخط لکھو۔

(الف) حضورؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے میں مسلمانوں کی نجات ہے۔

(ب) آج تم پر کوئی الزام نہیں، تم سب آزاد ہو۔

(ج) مسلمان سپاہی تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے تو دشمن پر خوف طاری ہو گیا۔

۴۔ ترانۂ ملّی

چین و عرب ہمارا ، ہندوستاں ہمارا
مُسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

دُنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

اے گلستانِ اندلس وہ دن ہیں یاد تجکو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

اے موجِ دجلہ! تو بھی پہچانتی ہے ہم کو؟
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

اے عرضِ پاک! تیری حُرمت پہ کٹ مرے ہم
ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز[۳] اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

۱۔ ملّی ترانہ، کو زبانی یاد کرو۔
۲۔ الفاظ کے معنی یاد کرو۔

لفظ	معنی
توحید	خدا کو ایک ماننا اور اس کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کرنا
بُتکدہ	وہ جگہ جہاں بت رکھے ہوں، بتخانہ۔
پاسبان	چوکیدار، حفاظت کرنے والا۔
سیل	پانی کا ریلا
سالار	سردار
سالارِ کارواں	قافلے کا سردار
میرِ حجاز	حضرت محمدؐ مصطفےٰ
خنجرِ ہلال کا	عیسائیوں کی صلیب کے بالمقابل اقبال نے خنجر کو مسلمانوں کا امتیازی، نشان قرار دیا جو پہلی رات کے چاند کی مانند ہوتا ہے اور جہاں سے مسلمانوں کے قمری مہینہ کا آغاز ہوتا ہے۔
باطل	جھوٹ
ارضِ پاک	اسلامی سرزمین
بانگِ درا	گھنٹی کی آواز جو قافلہ کے روانہ ہونے اور چلتے ہوئے بجتی ہے۔
جادہ پیما	راستہ پر روانگی

۳۔ نیچے لکھے ہوئے شعروں کو اپنی کاپی میں صاف صاف اور خوشخط نقل کرو۔

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے — آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں — خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

۵۔ ایک مکڑا اور مکھی

اک دن کسی مکھّی سے یہ کہنے لگا مکڑا،
اس راہ سے ہوتا ہے گزر روز تمہارا

لیکن مری کٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت
بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا

غیروں سے نہ ملئے تو کوئی بات نہیں ہے
اپنوں سے مگر چاہیئے یوں کھنچ کے نہ رہنا

آؤ جو مرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری
وہ سامنے سیڑھی ہے جو منظور ہو آنا

مکھّی نے سُنی بات جو مکڑے کی تو بولی
حضرت! کسی نادان کو دیجیے گا یہ دھوکا

اس جال میں مکھّی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا پھر نہیں اُترا

مکڑے نے کہا واہ فریبی مجھے سمجھے
تم سا کوئی نادان زمانے میں نہ ہوگا

منظور تمہاری مجھے خاطر تھی، وگرنہ
کچھ فائدہ اپنا تو مرا اس میں نہیں تھا

اڑتی ہوئی آئی ہو خدا جانے کہاں سے
ٹھہرو جو مرے گھر میں تو ہے اس میں بُرا کیا

اس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں
باہر سے نظر آتا ہے چھوٹی سی یہ کٹیا

لٹکے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے
دیواروں کو آئینوں سے ہے میں نے سجایا

مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں بچھونے
ہر شخص کو ساماں یہ میسر نہیں ہوتا

مکھّی نے کہا خیر یہ سب ٹھیک ہے لیکن
میں آپ کے گھر آؤں یہ اُمید نہ رکھنا

ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے
سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اُٹھ نہیں سکتا

مکڑے نے کہا دل میں، سُنی بات جو اس کی
پھانسوں اسے کس طرح؟ یہ کمبخت ہے دانا

سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندا

یہ سوچ کے مکھّی سے کہا اُس نے بڑی بی — اللہ نے بخشا ہے بڑا آپ کو رُتبا
ہوتی ہے اُسے آپ کی صورت سے محبت — ہو جس نے کبھی ایک نظر آپ کو دیکھا
آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں — سر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا
یہ حسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی — پھر اس پہ قیامت ہے یہ اُڑتے ہوئے کانا
مکھّی نے سنی جب یہ خوشامد تو پسیجی — بولی کہ نہیں آپ سے مجھ کو کوئی کھٹکا
انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں بُرا میں — سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا
یہ بات کہی اور اُڑی اپنی جگہ سے — پاس آئی تو مکڑے نے اُچھل کر اُسے پکڑا

بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی
آرام سے گھر بیٹھ کے مکھّی کو اُڑایا

الفاظ کے معنی :

لفظ	معنی	لفظ	معنی
کٹیا	جھونپڑی	رتبہ	درجہ، مرتبہ
کلغی	وہ پر جو کسی پرندے کے سر پہ تاج کی طرح ابھرے ہوتے ہیں	اُڑایا	کھایا
		کنی	ٹکڑا، ریزہ ہیرے کا
پسیجی	مہربان ہوئی نرم ہوئی		ریزہ۔

نظم کا مطلب :-

ایک دن ایک مکڑا کسی مکھّی سے کہنے لگا کہ " تم ہر روز اس طرف سے گزرتی ہو لیکن کبھی میری کٹیا میں نہیں آئیں۔ غیروں سے نہ ملو تو کوئی ہرج نہیں۔ لیکن اپنوں سے اس طرح دُور دُور رہنا اچھا نہیں۔ میرے گھر میں آؤ تو یہ میرے لیے عزّت کی بات ہے اگر آنا منظور ہو تو وہ سامنے سیڑھی ہے اُس پہ چڑھ کے آجاؤ۔

مکھّی نے مکڑے کی بات سُنی تو کہنے لگی ! حضرت ایسا دھوکا کسی نادان کو دیجیے۔

مکھی آپ کی چال میں کبھی نہیں آئے گی کیونکہ جو آپ کی سیڑھی پر چڑھتا ہے وہ پھر کبھی نہیں اُترتا (وہیں ختم ہو جاتا ہے)

مکڑے نے کہا۔ کیا آپ نے مجھے فریبی سمجھا ہے؟ اگر یہ بات ہے تو تم سا نادان دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ مجھے تو محض تمہاری خاطر منظور تھی ورنہ اس میں میرا اپنا کوئی فائدہ نہ تھا۔ خدا جانے کہاں سے اڑی ہوئی آئی ہو۔ اگر میرے گھر میں ٹھہرو اور سستا لو تو اس میں بُرائی کیا ہے؟ اس گھر میں آپ کو دکھانے کی بھی کئی چیزیں ہیں اگرچہ یہ باہر سے ایک کٹیا نظر آتا ہے۔ دروازے پر باریک پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ دیواروں کو آئینوں سے سجایا گیا ہے۔ اور مہمانوں کے آرام کرنے کے لیے بچھونے بھی ہیں۔ ہر شخص کو یہ سامان کہاں میسر آتا ہے۔

مکھی نے کہا۔ جی ہاں یہ سب درست ہے مگر یہ اُمید نہ رکھیے کہ میں آپ کے گھر آؤں۔ خدا مجھے ان نرم بچھونوں سے بچائے جو کوئی ان بچھونوں پر سوتا ہے وہ پھر کبھی نہیں اٹھتا (بس مر کے ہی اُٹھتا ہے)

مکڑے نے جب مکھی کی یہ بات سُنی تو اپنے دل میں سوچا یہ کمبخت تو سمجھدار نکلی۔ اس کو کس طرح پھانسوں! خوشامد سے دُنیا میں سیکڑوں کام نکلتے ہیں۔ دنیا میں جس کو دیکھو خوشامد کا بندہ ہے۔ یہ سوچ کر اُس نے مکھی سے کہا۔

"بڑی بی! اللہ نے آپ کو بڑا رتبہ بخشا ہے۔ جو کوئی آپ کو ایک نظر دیکھ لیتا ہے اس کو آپ کی صورت سے محبت ہو جاتی ہے۔ آپ کی آنکھیں کیا ہیں ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں ہیں۔ اور آپ کے سر کو خدا نے کلغی سے سجایا ہے۔ یہ حُسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی، پھر اس پر آپ کا اڑتے ہوئے گانا اور بھی قیامت ہے۔

مکھی نے جب یہ خوشامد کی باتیں سنیں تو مہربان ہو گئی اور بولی مجھے آپ سے کوئی کھٹکا نہیں ہے۔ میں انکار کی عادت کو اچھا نہیں سمجھتی۔ کسی کا دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا۔ یہ بات کہی اور اپنی جگہ سے اڑ کر مکڑے کے پاس آئی تو مکڑے نے اچھل کر اُسے پکڑ لیا۔ اور چونکہ وہ کئی دن کا بھوکا تھا اب جو مکھی ہاتھ آئی تو اس کو گھر میں آرام سے بیٹھ کے کھایا۔

اقبال نے اس نظم میں یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان اپنے پیٹ کے لیے کیسے کیسے ہتھکنڈے کرتا ہے اور کیسے کیسے فریب دیتا ہے ۔ اور جب اس کا فریب نہیں چلتا تو پھر خوشامد کر کے رام کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لیئے انسان کو ، غرض کے بندوں سے ہوشیار رہنا چاہیئے ۔ نہ ان کی فریب کی باتوں میں آنا چاہیئے نہ خوشامد سے خوش ہو کر ان کو دوست سمجھ لینا چاہیئے ۔ خوشامد اچھے اچھے عقلمندوں کو بیوقوف بنا دیتی ہے ۔ اور وہ جان بوجھ کر بھی دشمن کے ہاتھوں برباد ہو جاتے ہیں ۔

دوسری بات وہ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ انسان کی فطرت خوشامد کو کیسا پسند کرتی ہے کہ آدمی جان بوجھ کر بھی کہ فلاں شخص اس کا جانی دشمن ہے ۔ جب وہ شخص خوشامد کرنے لگتا ہے تو اس کی دشمنی کو بھول جاتا ہے اور اس طرح دشمن کو کامیاب ہونے کا موقع دیتا ہے اس لیے آدمی کو چاہیئے کہ اپنے اندر خوشامد پسندی کی عادت پیدا نہ ہونے دے ۔

مشق

۱۔ مکڑے اور مکھی کی گفتگو اپنے جملوں میں بیان کرو ۔

۲۔ اس شعر کو صاف صاف اور خوشخط اپنی کاپی میں نقل کرو ۔

غیروں سے نہ ملئے تو کوئی بات نہیں ہے اپنوں سے مگر چاہیئے یوں کھنچ کے نہ رہنا

۳۔ نیچے لکھے ہوئے الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کرو ۔

پسیجا ۔ اڑایا ۔ کھٹکا ۔ سجایا ۔ میسّر ۔

۶۔ ایک پرندہ اور جگنو

سرِ شام ایک مرغِ نغمہ پیرا
کسی ٹہنی پہ بیٹھا گا رہا تھا

چمکتی چیز اک دیکھی زمیں پر
اڑا طائر اسے جگنو سمجھ کر

کہا جگنو نے او مرغِ نوا ریز
نہ کر بیکس پہ منقارِ ہوس تیز

تجھے جس نے چہک، گل کو مہک دی
اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی

لباسِ نور میں مستور ہوں میں
پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں

چمک تیری بہشتِ گوش اگر ہے
چمک میری بھی فردوسِ نظر ہے

پروں کو میرے قدرت نے ضیا دی
تجھے اس نے صدائے دلربا دی

تری منقار کو گانا سکھایا
مجھے گلزار کی مشعل بنایا

چمک بخشی مجھے، آواز تجھ کو
دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو

مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز
جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز

قیامِ بزمِ ہستی ہے انہیں سے
ظہور اوج و پستی ہے انہیں سے

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

ایک پرندہ اور جگنو

شام کا وقت تھا ایک گانے والا پرندہ کسی درخت کی ٹہنی پر بیٹھا گا رہا تھا۔ ایک جمکتی ہوئی چیز زمین پر دیکھی تو اُسے جگنو سمجھ کر اڑا اور اُس کے پاس جاکر اُس پر چونچ مارنے لگا۔ جگنو نے کہا " اے پرندے! ایک بیکس پر چونچ نہ مار.... جس نے تجھے چہکنا اور پھولوں کو مہکنا عطا کیا ہے۔ اسی اللہ نے مجھے روشنی دی ہے میں نور کے لباس میں چھپا ہوا پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں۔ اگر تیرا گانا کانوں کی جنت ہے تو میری روشنی آنکھوں کی بہشت ہے۔ قدرت نے میرے پروں کو روشنی دی ہے تو تجھے دلکش آواز دی ہے۔ تجھے گانا سکھایا تو مجھے باغ کی مشعل بنایا ہے مجھے چمک بخشی ہے تو تجھے آواز۔ مجھے سوز دیا ہے تو تجھے ساز۔ غرضکہ اس دنیا کی محفل میں ہم آہنگی آپس میں صلح صفائی رکھنے کے ذریعے ہی سے قائم ہے۔ جس وقت دنیا میں صلح اور محبت کے بجائے مخالفت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے تو دنیا کی ساری رونق ختم ہو جاتی ہے۔

۱۔ یہ اقبال کی نظم " ایک پرندہ اور جگنو " کا مضمون ہے۔ اس نظم کے ذریعے اقبال یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اس لیے بھی ان میں باہم، صلح اور محبت ہونی چاہیئے اور اس دنیا کا چین اور آرام بھی آپس میں محبت اور اتحاد رکھنے ہی سے رہتا ہے اس لیے بھی ایک دوسرے کی مخالفت کرنے اور لڑتے بھڑنے کے بجائے سب کو میل ملاپ اور محبت سے رہنا چاہیئے تاکہ دنیا کی رونق بھی قائم رہے اور اس کے بسنے والوں کو چین اور آرام بھی نصیب ہو۔

مشق

۱۔ نیچے لکھے ہوئے جملوں میں خالی جگہ کو پُر کرو۔

(الف) پرندہ درخت کی ٹہنی پر بیٹھا ..... تھا

(ب) میں پتنگوں کے جہان کا ..... ہوں

(ج) اگر تیرا گانا ..... جنت ہے تو میری روشنی آنکھوں کی ..... ہے۔

۲۔ اقبال کی نظم کے اس شعر کو زبانی یاد کرو۔

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی　　اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

۳۔ ان دو شعروں کو خوش خط اور صاف صاف اپنی کاپی میں نقل کرو۔

کہا جگنو نے او مرغِ نوا ریز　　نہ کر بیکس پہ منقار ہوس تیز

تجھے جس نے چہک، گل کو مہک دی　　اُسی اللہ نے مجھ کو چمک دی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
ہوس	کسی چیز کی بہت زیادہ خواہش کرنا۔	سوز	جلن مخالفت، رنج و تکلیف
طور	وہ پہاڑ جس پر حضرت موسیٰ نے خدا کا جلوہ دیکھا تھا	ساز۔	صلح، موافقت کرنا آرام
بہشت	جنت	رفیق	ساتھی، دوست
دلکش	دل کو لبھانے والی	بزم ہستی	دُنیا کی محفل یعنی دُنیا
مشعل	لکڑی کے سرے پر کپڑے کی موٹی بتی باندھ کر اُس کو تیل ڈال کر جلاتے ہیں	ہم آہنگی۔	یکسان، موزونیت اتفاق

۴۔ نیچے دیئے ہوئے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔

ہوس ، دلکش ۔ رفیق ۔ طُور ۔ بہشت

۷۔ ایک پرندہ جو پیاس سے بیتاب تھا

ایک پرندہ پیاس کی وجہ سے بیتاب تھا۔ اُس کو باغ میں ایک ہیرے کا ٹکڑا نظر آیا۔ پیاس کی وجہ سے اُس نے اُس ہیرے کو پانی سمجھ لیا۔ اور پاس جا کر اُس پر چونچ مارنے لگا تاکہ اُس سے اپنی پیاس بجھائے۔ مگر اُس کو پانی نہ ملا۔

ہیرے نے کہا، اے نادان! تو مجھ پر چونچ کیا مارتا ہے میں پانی نہیں ہوں ہیرا ہوں! میرے پانی سے تیری پیاس نہیں بجھے گی۔ میں دوسروں کے لیے زندہ نہیں ہوں کہ دوسرے مجھے استعمال کریں اگر تو مجھ سے اپنا کام نکالنا چاہتا ہے تو یہ تیری کم عقلی ہے۔ میرا پانی پرندوں کی منقار کو توڑ دیتا ہے بلکہ اس سے آدمی بھی ہلاک ہو جاتے ہیں۔

ہیرے سے نا امید ہو کر وہ پرندہ وہاں سے چل دیا۔ اتنے میں اُسے شبنم کا قطرہ نظر آیا جو شاخ پر چمک رہا تھا اور آفتاب کے ڈر سے کانپ رہا تھا۔ پرندہ شاخ کے نیچے پہنچا تو شبنم کا قطرہ اس کے منہ میں ٹپک گیا۔

لوگو! اگر تم دشمن سے اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو میں پوچھتا ہوں تم قطرہ ہو یا ہیرا؟ پرندہ پیاس کی تکلیف سے بے چین تھا تو اُس نے دوسرے کی زندگی کو اپنا سرمایہ بنا لیا۔ ہیرا سخت تھا ——— اس لیے باقی رہا۔ قطرہ سخت نہ تھا اس لیے ختم ہو گیا۔ اگر تم اپنی بقا چاہتے ہو تو ہیرا بنو، شبنم نہ بنو۔

۱۔ یہ حکایت "اسرارِ خودی" سے لی گئی ہے۔

۲۔ حکایت کا مقصد خود اقبال نے بیان کر دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنی خودی کی حفاظت کرنے سے ایک دم کے لیے بھی غافل نہ رہو۔ ہیرے کے ٹکڑے کی طرح مضبوط بننا چاہیے

شبنم کی طرح نرم بننا اچھا نہیں ہوتا۔

۳۔ "خودی" کے معنی ہیں " اپنی ذات میں چھپی ہوئی قوتیں اور صلاحیتیں"، یعنی جو لوگ اپنی ذات میں چھپی ہوئی قوتوں کو پہچانتے ہیں اور ان سے کام لیتے ہیں۔ ان کے اندر مضبوطی پیدا ہوتی ہے اور وہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر یہ بات بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لیے آدمی کو اچھے علم اور اچھی صحبت میں بیٹھ کر اچھی عادتیں اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ اپنی چھپی ہوئی قوتوں کو صحیح طور پر استعمال کر سکے۔

مشق

۴۔ الفاظ کے معنی یاد کرو۔

لفظ	معنی	لفظ	معنی
بیتاب	بے قرار، بے چین،	سرمایہ	پونجی
پانی	چمک، آب، ہیرے اور موتی وغیرہ کی چمک دمک کو اُس کی آب کہتے ہیں	بقا	زندگی

۵۔ نیچے لکھے ہوئے اَدھورے جملوں کو پورا کرو۔

(الف) ایک پرندہ پیاس کے مارے . . . . . .

(ب) دو کبوتر ہوا میں . . . . . .

(ج) اتنے میں پرندے کو شبنم کا . . . . . .

۶۔ نیچے دیئے ہوئے الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔

بیتاب ۔ ہوس ۔ آفتاب ۔ سرمایہ ۔ پیاس

۷۔ اپنی کاپی میں صاف صاف اور خوشخط نقل کرو۔

اگر تم بقا چاہتے ہو تو ہیرا بنو، شبنم نہ بنو۔

۸۔ خلیفہ ہارون رشید اور امام مالکؒ

مسلمانوں کے امیر ہارون رشید نے حضرت امام مالکؒ کو پیغام بھیجا کہ " اے محترم! میں آپ سے حدیث پڑھنا چاہتا ہوں۔ مہربانی فرما کر عراق تشریف لائیے۔ عراق کا کیا کہنا ہے! یہاں کا دن کیسا روشن ہوتا ہے! پھر عراق کے انگوروں کی تو تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ جن سے آبِ حیات ٹپکتا ہے۔ اور عراق کی خاک زخم کے لیے شفا دینے والے مرہم کا کام کرتی ہے۔

حضرت مالکؒ نے جواب دیا کہ امیرالمومنین! میں محمد مصطفےٰؐ کا نوکر ہوں اور میرے سر میں مصطفےٰؐ کے خیال کے سوا اور کوئی خیال نہیں ہے۔ بھلا میں اس آستانے کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں! عراق کے دن سے تو یہاں کی رات بدرجہا بہتر ہے عشق کہتا ہے کہ بس میرا کہنا مان اور بادشاہوں کو اپنی چاکری میں بھی قبول نہ کر اور آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کا غلام بن جاؤں! پھر یہ بھی کس قدر عجیب بات ہے کہ آپ کو پڑھانے کے لیے میں آپ کے دروازے پر حاضر ہوں! امیرالمومنین قوم کا چاکر آپ کا چاکر نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ علم دین سیکھنا چاہتے ہیں تو میرے شاگردوں کے ساتھ درس میں آکر بیٹھئے۔

یہ حکایت اقبال کی کتاب، رموزِ بیخودی" سے لی گئی ہے۔ رموزِ بیخودی فارسی نظم ہے جس کا خلاصہ اُردو میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں اقبال نے بتایا ہے کہ اسلام کا بنایا ہوا آئین قوم کے لیے بہترین ضابطہ ہے۔ اور مختلف اسلامی اصولوں پر بحث کر کے یہ بات مسلمانوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنے اسلامی آئین پر کسی دوسرے آئین

کو ترجیح نہ دیں۔ بلکہ اپنے اسلامی آئین کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ تاکہ وہ عزت کی زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں۔

اس حکایت میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام کو سمجھنے والے ایسے خود دار ہوتے ہیں کہ وہ خُدا اور رسول کی محبت اور قوم کی خدمت کے مقابلے میں کسی چیز کو خیال میں، نہیں لاتے۔ ایسے ہی مضبوط خودی کے مالک لوگوں نے دنیا میں اسلام پھیلایا ہے اور دین کی خدمت کی ہے۔

مشق

۱۔ نیچے لکھے ہوئے جملوں میں خالی جگہ کو پر کرو۔

(الف) خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالک کو ..... بھیجا۔

(ب) میرے سر میں محمد مصطفےٰ ﷺ کے خیال کے سوا اور ..... نہیں ہے

(ج) قوم کا خادم بادشاہ ..... نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ہارون الرشید اور امام مالک رضؓ کی حکایت کو اپنے جملوں میں بیان کرو۔

۳۔ ان الفاظ کے معنی یاد کرو۔

لفظ	معنی	لفظ	معنی
حدیث	جو کچھ رسول ﷺ خدا نے فرمایا	آستانہ	دہلیز، چوکھٹ، بارگاہ
آبِ حیات	وہ پانی جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ اس کے پینے سے قیامت تک موت نہیں آتی	درس	سبق
		علم دین	دین کا علم، قرآن اور حدیث وغیرہ۔

۴۔ ان جملوں کو اپنی کاپی میں صاف صاف اور خوشخط نقل کرو۔

(الف) میرے سر میں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال کے سوا اور کوئی خیال نہیں ہے

(ب) قوم کا خادم بادشاہ کا نوکر نہیں ہو سکتا۔

۹۔ ہمدردی

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا
بلبل تھا کوئی اُداس بیٹھا

کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی
اُڑنے چُگنے میں دن گزارا

پہنچوں کس طرح آشیاں تک؟
ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا

سُن کر بُلبل کی آہ و زاری
جگنو کوئی پاس ہی سے بولا

حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے
کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا

کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی کروں گا

اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل
چمکا کے مجھے دیا بنایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

۱۔ کسی درخت کی شاخ پر ایک بُلبل اداس بیٹھا تھا۔ اور یہ کہہ رہا تھا کہ: افسوس میں نے سارا دن اڑنے چُگنے میں گزار دیا اور اب رات آگئی ہے میں اپنے گھر کس طرح پہنچوں، ہر چیز پر اندھیرا چھا گیا ہے۔ وہیں ایک جگنو بھی بُلبل کا رونا دھونا سُن رہا تھا وہ کہنے لگا "اگرچہ میں ذرا سا کیڑا ہوں مگر آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ رات سر پر آگئی تو غم نہ کیجیے میں راستے میں روشنی کروں گا۔ کیونکہ اللہ نے مجھے مشعل دی ہے۔

۲۔ اقبال نے اس نظم کا مقصد آخری شعر میں بیان کیا ہے یعنی وہی لوگ دُنیا میں اچھے ہیں جو دوسروں کے کام آتے ہیں تم اتنا اور سمجھ لو کہ دوسروں کی مدد کرنے میں اپنی کم درجے کی حیثیت کو نہیں دیکھنا چاہیے کہ ہم کیا حیثیت رکھتے ہیں جو کسی کی مدد کریں! یہ خیال

غلط ہے بلکہ جو کچھ تم کر سکتے ہو اس میں کمی نہ کرو کہ یہی تمہارا اخلاقی فرض ہے۔

مشق

۳ - آخری شعر کو زبانی یاد کر کے اپنی کاپی میں صاف صاف اور خوشخط لکھو۔

۴ - الفاظ کے معنی یاد کرو۔

لفظ	معنی	لفظ	معنی
شجر	درخت	مشعل	کپڑے کی بڑی بتی جو تیل میں تر کر کے لکڑی کے ایک سرے پر باندھ کر جلاتے ہیں۔
اُداس	رنجیدہ		
آشیاں	گھونسلا		
آہ و زاری	رونا دھونا		

۵ - نیچے کے جملوں میں خالی جگہ کو پُر کرو۔

(الف) کسی درخت کی شاخ پر ایک بُلبل . . . . . بیٹھا تھا۔

(ب) اگرچہ میں ذرا سا . . . . . ہوں۔

(ج) اللہ نے مجھے . . . . . دی ہے۔

۶ - ان لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔

اُداس آہ و زاری ۔ آشیاں۔

۱۰۔ سیرِ فلک

ایک نظم میں اقبال نے اپنی آسمان کی خیالی سیر کا بیان اس طرح کیا ہے۔

میں اپنے خیال میں ایک دن آسمان کی طرف روانہ ہوا۔ اُڑتا چلا جا رہا تھا اور آسمان پر میرا جاننے والا کوئی نہ تھا تارے مجھے بڑے تعجب سے دیکھ رہے تھے ان کے لیے میرا سفر ایک ایسا راز تھا جس سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ میں اس پرواز میں اتنا بلند ہو گیا کہ صُبح و شام کا یہ پرانا نظام بھی پیچھے رہ گیا، اس بلندی پر پہنچ گیا جہاں صُبح و شام نہ تھے۔ وہاں پہنچ کر میں نے جنت کو دیکھا۔ جنت کی تعریف کیا کروں بس یہ سمجھ لو آنکھوں اور کانوں کی تمام تمناؤں کے پورا ہونے کی جگہ ہے۔ دیکھنے کی چیزیں بھی ایسی ایسی خوشنما اور خوبصورت ہیں کہ بیان نہیں کر سکتا اور آوازیں بھی ایسی دلکش کہ کانوں نے ایسی آوازیں زندگی میں کبھی نہیں سنیں۔ طوبیٰ کی شاخوں پر پرندے بڑے میٹھے سروں میں راگ گا رہے تھے۔ اور جنت کی حوریں اپنا جمال دکھا رہی تھیں خوبصورت ساقی اپنے ہاتھوں میں جام لیے شرابِ طہور پلا رہے تھے۔ اور پینے والے خوشی میں، مست شور کر رہے تھے۔

جنت سے دُور ایک تاریک گھر نظر آیا جہاں بالکل سناٹا تھا۔ اور ٹھنڈک بھی تھی۔ اس گھر کے اندھیرے کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔ اور ٹھنڈا ایسا تھا جیسا "کُرۂ زمہریر"۔ میں نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو جو جواب ملا وہ بڑا حیرت میں ڈال دینے والا تھا۔ کہا یہ ٹھنڈا مقام دوزخ ہے۔ یہاں نہ آگ ہے نہ روشنی۔ یہ ان دونوں چیزوں سے خالی ہے۔ اس کے شعلے جن کے بارے میں سُن سُن کر لوگ کانپتے ہیں مانگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے اپنے نہیں ہوتے۔ مانگے ہوئے اس طرح کہ دنیا والے جو یہاں آتے

ہیں اپنے انگارے ساتھ لاتے ہیں۔ یعنی وہ جو کچھ دنیا میں بُرے کام کرتے ہیں وہ ان کے ساتھ آتے ہیں اور یہاں وہ بُرے کام ان کے لیے انگارے بن جاتے ہیں۔

مشق

۱۔ تم اس نظم کے آخری شعر کو زبانی یاد کر لو۔ اور اسی کو اپنی کاپی میں خوشخط نقل کرو۔ شعر یہ ہے۔

اہلِ دنیا یہاں جو آتے ہیں　　اپنے انگارے ساتھ لاتے ہیں

۲۔ الفاظ کے معنی یاد کرو۔

لفظ	معنی	لفظ	معنی
راز	بھید	جمال	حُسن۔ خوبصورتی
طوبیٰ	جنت میں ایک درخت ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کی ایک ایک شاخ ہر جنتی کے گھر میں ہو گی۔	ساقی	پلانے والا
		شراب طہور	جنت کی پاک شراب۔
		تاریک۔	سیاہ وہ جگہ جہاں اندھیرا ہو
		کُرّہ زمہریر۔	وہ کرہ جہاں سخت سردی ہوتی ہے یہ کُرہ ہوا کے وسط میں ہے۔
حُور	جنت کی عورتیں جو نہایت خوبصورت ہوں گی		

۳۔ نیچے کے جملوں کو پورا کرو۔

(الف) طوبیٰ کی شاخوں پر پرندے میٹھے میٹھے سروں میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(ب) انسان اپنی جنت اور دوزخ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(ج) خوبصورت ساقی اپنے ہاتھوں میں جام لیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۱۱۔ ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب!
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو!

مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

لذت سرود کی ہو، چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش کے زمین کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
اُمید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے اُن کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کویل، وہ صبح کی مؤذن
میں اُس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مرا دعا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید اُنہیں جگا دے

نظم کا مطلب :-

اے اللہ ! اب دنیا کی محفلوں میں میرا جی نہیں لگتا ۔ اس لیے کہ لوگوں کی غفلت اور خود غرضیوں کو دیکھ کر میرا دل بجھ گیا ۔ اور جب دل بجھ گیا ہو تو محفل کا لطف نہیں آسکتا ۔

اب تو جی یہ چاہتا ہے کہ کسی پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنالوں جہاں چڑیوں کے چہچہانے میں گانے کا مزہ ہو اور قدرتی چشموں کے شور میں باجے کی آواز کا لطف ہو ۔ بلبل مجھ سے ایسی گھل مل جائے کہ اس کے دل میں میرا ڈر بالکل نہ رہے جھونپڑی کے دونوں طرف ہرے ہرے بوٹے صف باندھے کھڑے ہوں ۔ اور ندی کا صاف شفاف پانی ان کی تصویر لے رہا ہو ۔

پہاڑوں کا نظارہ ایسا دلکش ہو کہ پانی بھی موج بن کر اُسے اُٹھ اُٹھ کے دیکھ رہا ہو ۔

زمین کی گود میں سبزہ سویا ہوا ہو اور جھاڑیوں میں بہتا ہوا پانی جگہ جگہ چمک رہا ہو ۔ پھولوں کی شاخ جھک جھک کر پانی کو چھو رہی ہو جیسے کوئی حسین آئینہ دیکھتا ہے شام کے وقت جب سورج شام کی دلہن کو مہندی لگائے (یعنی آسمان کے کناروں پر شفق نمودار ہو) تو پھولوں کا لباس سرخ نظر آنے لگے ۔

رات میں سفر کرنے والے جب تھک کر رہ جائیں تو میرے ٹوٹے ہوئے دیئے کی روشنی ان کو یہ امید دلائے کہ رات گزارنے کی جگہ موجود ہے اور جب آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں اور ہر طرف اندھیر گھپ ہو تو بجلی کی چمک میں ان کو میری کٹیا نظر آجائے ۔

کویل جو پچھلی رات کُوکتی ہے ۔ اُس کی کوک اذان کا کام دے ۔ میں اٹھ بیٹھوں اور خدا کی یاد میں لگ جاؤں ۔ اور اس طرح کویل اور میں ایک دوسرے کے ہم نوا ہو جائیں میرے کانوں پر مسجد اور مندر کا احسان نہ ہو ۔ یعنی میں مسجد کی اذان یا مندر کے سنکھ کی آواز سے بیدار نہ ہوں بلکہ جھونپڑی کے سوراخ سے جو روشنی نظر آئے اس سے

سمجھ لوں کہ صبح ہو گئی ہے ۔ اور جس وقت شبنم پھولوں کو وضو کرانے آئے تو میرا رونا میرا وضو ہو اور میرا نالہ میری دُعا ہو ۔ اور یہ رونا ایسا اثر پیدا کرے کہ اس سے بے درد مند دل رونے لگ جائے اور شاید اسی طرح غفلت میں پڑے سوئے ہوئے لوگ جاگ اٹھیں !

جس کیفیت میں اقبال نے یہ نظم لکھی ہے وہ کبھی کبھی قوم کے ہر سچے خیر خواہ کے دل میں پیدا ہوتی ہے ۔ قوم کا سچا خیر خواہ جب دیکھتا ہے کہ لوگ غفلت میں پڑے ہوتے ہیں ۔ اور ان کے دل میں ایک دوسرے سے ہمدردی کے بجائے خود غرضی ہی خود غرضی ہے ۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اغراض میں گم ہو کر خدا کو بھی بھلا دیتے ہیں ۔ اور جو جی میں آتی ہے کرتے رہتے ہیں تو اُسے ایسے لوگوں کی صحبت سے بیزاری محسوس ہونے لگتی ہے ۔ اور وہ چاہتا ہے کہ ان سے بھاگ کر بہت دور چلا جائے ۔ ایسی جگہ جہاں قدرت کے نظارے اس کی نگاہ کے سامنے ہوں ۔ ایسے نظارے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اور ان قدرتی نظاروں میں وہ سب کچھ بھول کر خدا کی یاد میں محو ہو جائے ۔

اقبال نے بڑی خوبصورتی سے یہ بھی بتا دیا کہ ایسے خود غرض اور غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں سے تو قدرتی مناظر اور جنگل کی تنہائی میں رہنا بہت اچھا ہے ۔ جہاں کی ہر چیز سے رنج و غم کے بجائے مسرت و شادمانی حاصل ہوتی ہے اور جہاں پرندے تک خدا کی یاد کرتے ہیں لیکن وہاں بھی وہ خود غرضی سے دور رہ کر لوگوں کی کسی نہ کسی طرح خدمت ہی کرنا چاہتے ہیں ۔ مثلاً رات کے مسافر جب تھک کر رہ جائیں تو وہ اُن کی کٹیا میں قیام کر سکیں ۔ اور وہ وہاں پچھلی رات کو اٹھ کر یکسوئی کے ساتھ خدا کا ذکر کریں اور رو رو کر دعا مانگیں کہ الٰہی ان لوگوں کو سمجھ عطا فرما کہ یہ خود غرضی چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کریں اور غفلت کی نیند سے بیدار ہو کر اپنی ترقی کی منزلوں کی طرف چل پڑیں ۔

اس نظم کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو مناظرِ قدرت کی تصویر کھینچنے میں کیسا کمال حاصل تھا ۔

مشق

لفظ	معنی	لفظ	معنی
اُکتانا۔	بیزار ہونا، تنگ آنا۔	نظارہ	تماشا۔ منظر
	جی نہ لگنا	موج	لہر
مرتا ہوں	بہت زیادہ چاہتا ہوں	آغوش	گود
خامشی	خاموشی	قبا	لباس
سرود	گانا	دیا	چراغ
شورش	شور	مؤذّن	اذان دینے والا
مانوس	محبت کرنے والا	ہم نوا	ہم آواز
	چاہنے والا۔ بے تکلف	دَیر	مندر
کھٹکا	ڈر	حرم	کعبہ۔ مسجد
دل فریب	دلکش	سحر نما	صبح دکھانے والا

نیچے لکھے ہوئے ادھورے جملوں کو پورا کرو۔

(الف) دنیا کی محفلوں میں . . . . . نہیں لگتا۔

(ب) چڑیوں کے چہچہانے میں . . . . . مزہ ہو۔

(ج) پھولوں کی شاخ جھک جھک کر . . . . . چھو رہی ہو۔

۶۔ اقبال نے تنہا رہنے کی آرزو کس وجہ سے کی ہے۔

۷۔ ذیل کے اشعار کو صاف صاف اور خوشخط اپنی کاپی میں نقل کرو اور زبانی بھی یاد کرو۔

(الف)

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ — پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی — جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

(ب)

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے — رونا مرا وضو ہو، نالہ مرا دعا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے — بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

۱۲۔ شکوہ اور جوابِ شکوہ سے انتخاب

(شکوہ)

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کیلئے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے

تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی، حکومت کے لیے
سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لیے؟

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی؟

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے

تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے، ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

(جوابِ شکوہ)

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک

حرمِ پاک بھی، اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب — زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا، تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا، تو غریب — پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب

اُمَرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے مِلّتِ بیضا غُربا کے دم سے

تم ہو آپس میں غضب ناک وہ آپس میں رحیم — تم خطاکار و خطابیں، وہ خطاپوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم — پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم

تختِ فغفور بھی اُن کا تھا سریر کے بھی
یوں ہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیّت ہے بھی؟

۱۔ یہ دونوں نظمیں اقبال کی کتاب "بانگ درا" سے لی گئی ہیں۔ ہم نے تین تین بند دونوں میں سے انتخاب کیے ہیں۔

۲۔ نظم "شکوہ" اپریل ۱۹۱۱ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی۔ اس کے چند ماہ بعد موچی دروازہ کے باہر ایک بہت بڑے جلسے میں "جواب شکوہ" سنائی گئی۔ یہ جلسہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے اہتمام میں "جنگ بلقان" کے سلسلے میں ہوا تھا تاکہ ترکوں کے لیے چندہ جمع کیا جائے۔ نظم کے ختم ہونے پر اس کی ہزاروں کاپیاں فروخت ہوئیں اور وہ تمام روپیہ بلقان فنڈ میں دے دیا گیا۔

اشعار کا مطلب:۔

اقبال کو قوم کی موجودہ حالت پر ایسا رنج ہوا کہ خدا سے شکوہ کرنے پر مجبور ہو گئے شکوے میں مسلمانوں کی اسلام کے لیے قربانیوں اور اعلیٰ درجے کے کارناموں کا ذکر کرتے ہیں تاکہ خدا اِن پر پہلے کی طرح مہربان ہو جائے اور وہ پھر دنیا میں ویسا ہی عزت کا مقام حاصل کر لیں جیسا اُن کو پہلے کبھی حاصل تھا۔ شکوے کے تینوں بند اسلاف کے اسی قسم کے کارناموں پر مشتمل ہیں۔

پہلا بند :- خدا سے عرض کرتے ہیں کہ اے خدا ! ہم زندہ تھے تو اس لیے کہ اسلام کی خاطر کافروں سے جنگ کریں اور مرتے تھے تو اس بات پر کہ دنیا میں تیرا نام بلند ہو ۔ ہم نہ حکومت کے لیے لڑتے تھے نہ دولت کے لیے بلکہ صرف تیرے دین کی خاطر لڑتے تھے ۔ اگر ہم زر و مال پر مرتے تو بتوں کو توڑنے کی بجائے ان کے بدلے میں دولت حاصل کرتے ۔

سلطان محمود غزنوی ؒ جب سومنات کے مندر میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں گرز تھا ۔ مندر کے پجاریوں نے عرض کیا کہ سلطان ! ہمارے دیوتاؤں کو نہ توڑو اس کے بدلے میں جتنا زر و جواہر آپ کو چاہیئے ہم سے لے لیں مگر محمود نے کہا میں بت فروش نہیں ہوں ۔ بت شکن ہوں ! اور یہ کہہ کر بت کو گرز مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ۔ اقبال نے اپنے شعر میں اسی تاریخی واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

دوسرا بند :- اگر ہم کسی لڑائی میں اڑ جاتے تھے تو پھر کسی طرح بھی نہیں ٹلتے تھے ۔ ہمارے مقابلے میں بڑے بڑے شیر دل بہادر بھی نہیں ٹھہر سکتے تھے ۔ اور اگر تجھ سے کوئی سرکشی کرتا تھا تو ہم غصے میں آپے سے باہر ہو جاتے تھے اور پھر تلوار کیا چیز ہے توپ سے بھی لڑ جاتے تھے ۔ اس طرح اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر تلواروں کے سائے میں تیرا پیغام سناتے اور لوگوں کے دلوں پر تیری توحید کا نقش بٹھاتے تھے ۔

تیسرا بند :- اگر عین لڑائی میں نماز کا وقت آگیا تو فوراً قبلہ کی طرف رُخ کر لیا اور نماز ادا کی اور اس شان سے ادا کی کہ بادشاہ اور غلام ایک ہی صف میں کاندھے سے کاندھا مِلا کر کھڑے ہو گئے ۔ غلام اور آقا میں کوئی فرق باقی نہ رہا ۔

(جواب شکوہ)

شکوے کے جواب میں خدا کی طرف سے یہ ارشاد ہوا کہ تم نے جو مسلمانوں کے کارنامے بیان کیے ہیں وہ تمہارے باپ دادا کے کارنامے ہیں ۔ تم ذرا اپنی حالت

دیکھو کہ تم کیا ہو۔ تمہاری حالت تو اتنی خراب ہے کہ تمہیں مسلمان کہنا بھی اسلام کی توہین ہے۔

پہلا بند :۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اس قوم کا نفع ــــ اور نقصان اللہ اور نبیؐ دین اور ایمان حرم اور قرآن سب کچھ ایک ہے۔ لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس کے باوجود خود مسلمان ایک نہیں ہیں۔ یہ بے شمار فرقوں اور ذاتوں میں تقسیم ہو گئے ہیں پھر خود ہی بتاؤ کیا دنیا میں خوش رہنے اور ترقی کرنے والوں کی یہی علامتیں ہیں؟

دوسرا بند :۔ جبکہ حال یہ ہے کہ مسجدوں میں نماز کے یہ صفیں بھی غریب بناتے ہیں۔ روزے کی زحمت بھی غریب گوارا کرتے ہیں۔ بلکہ اب تو ہمارا نام بھی غریب ہی لیتے ہیں۔ امیر تو اپنی دولت کے نشے میں ایسے مست ہوئے ہیں کہ ہم کو بھول کر بھی یاد نہیں کرتے۔ اسلام اگر باقی ہے تو غریبوں کے دم سے باقی ہے۔

تیسرا بند :۔ تم اپنے باپ دادا کے کارناموں پر فخر کرتے ہو۔ مگر یہ سوچو کہ تم میں اور ان میں کتنا بڑا فرق ہے! تم آپس میں غضبناک ہو، وہ آپس میں رحیم تھے تم خطائیں کرتے ہو، اور دوسروں کی خطائیں دیکھتے پھرتے ہو اور وہ دوسروں کی خطاؤں کو چھپاتے تھے ایک دوسرے پر کرم کرتے اور مہربانی کرتے تھے۔

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ تم ــــ ان کی طرح بلند مقام پر تو پہنچنا چاہتے ہو۔ مگر اُن کی سی غیرت وحمیت اپنے اندر نہیں رکھتے۔ وہ کام کرتے تھے تم بائیں بناتے ہو بھلا محض باتوں سے بھی کسی قوم نے دنیا میں عزت کا مقام حاصل کیا ہے۔ تمہارے بزرگوں نے آپس میں محبت اور اتحاد پیدا کیا اور ہمارے بتلائے ہوئے طریقے پر چلے تو ہم نے ان کو ایران اور روم کے تخت وتاج دے دیئے۔ تم نے اتفاق اور محبت چھوڑ کر فرقہ بندی کا راستہ اختیار کیا اور ہمارے احکام سے سرکشی کی تو اس پستی و ذلت کی حالت کو پہنچ گئے۔ ہم تو عمل کے مطابق بدلہ دیتے ہیں۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

مشق

۱۔ شکوہ اور جواب شکوہ کے اشعار زبانی یاد کرو۔

۲۔ نیچے لکھے ہوئے ادھورے جملوں کو پورا کرو۔

(الف) اگر ہم زر و مال پر مرتے تو . . . . . توڑنے کی بجائے ان کے بدلے میں . . . . . حاصل کرتے۔

(ب) ہمارے مقابلے میں . . . . . نہیں ٹھہر سکتے تھے۔

(ج) تمہاری حالت تو اتنی خراب ہے کہ تم کو . . . . . اسلام کی توہین ہے

۳۔ نیچے دیئے ہوئے الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔

غضبناک ۔ رحیم ۔ خطا ۔ توحید ۔ حمیّت ۔

۴۔ مشکل الفاظ کے معنی یاد کرو۔

لفظ	معنی	لفظ	معنی
جنگ	لڑائی	زحمت	تکلیف
عظمت	عزت و مقام	اُمرا	امیر کی جمع ہے۔
تیغ زنی	تلوار چلانا	ملّتِ بیضا	اسلام
سر بکف	سر ہتھیلی پر لیے ہوئے	غضبناک	غصہ میں بھرا ہوا
بُت فروشی	بتوں کا بیچنا	رحیم	رحم کرنے والا
بت شکنی	بتوں کا توڑنا	قلبِ سلیم	درست اور دُور اندیش دل
تیغ	تلوار		
قبلہ رُو	قبلے کی طرف رُخ کرنا	تختِ فغفور	چین کے بادشاہ کا تخت
قومِ حجاز	مسلمان		
توحید	خُدا کو ایک ماننا	خطاکار	خطا کرنے والا
زیرِ خنجر	تلوار کے نیچے	خطابیں	خطا دیکھنے والا
بندہ	غلام	خطاپوش	خطا کو چھپانے والا

لفظ	معنی	لفظ	معنی
غنی	مالدار	اوجِ ثریا	ثریا کی بلندی ۔ ثریا
منفعت	نفع		ستاروں کا ایک مجموعہ
حرم	کعبہ		ہے ساتویں آسمان پر
فرقہ بندی	فرقے بنانا ۔ ٹولیوں	سریر کے	ایران کا تخت
	میں تقسیم ہونا ۔	حمیت	غیرت
صف آرا ۔	صفیں بنانے والے		

۱۳۔ باز اپنے بچے کو نصیحت کرتا ہے

بیٹے تو جانتا ہے کہ تمام باز حقیقت میں ایک جیسی خوبیاں رکھتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں مٹھی بھر پروں سے زیادہ نہیں ہوتے مگر اپنے پہلو میں شیر کا سا دل رکھتے ہیں۔ تو بھی اپنے اندر جرأت اور حمیّت پیدا کر اور بڑی اعلیٰ درجے کی چیز کا چاہنے والا بن۔ کبک تورنگ اور سارس وغیرہ سے دُور رہ۔ اُن سے صرف شکار کرنے کے وقت مل کیونکہ یہ قوم بڑی ڈرپوک، کمینہ خصلت ہے کہ اپنی چونچ مٹی سے آلودہ کرتی ہے۔

وہ باز جو اپنے شکار کے جانوروں سے زندگی کا طریقہ سیکھتا ہے آخر انہیں کا شکار ہو جاتا ہے۔ بہت سے ٹکڑے زمین پر گر گئے اور دانہ چننے والے پرندوں کی صحبت میں پڑ کر ہلاک ہو گئے۔ تو اپنی خوبیوں کی حفاظت کر اور خوش خوش زندگی گزار۔ دلیر سخت اور طاقتور رہ۔ جسمانی نرمی اور نزاکت تیتر وغیرہ کا حصّہ ہیں تیری رگیں ہرن کے سینگوں کی طرح سخت ہونی چاہئیں کہ دنیا میں خوش رہنا انہیں کا حق ہے جو سخت طاقتور اور محنتی ہوتے ہیں۔

عقاب نے اپنے بیٹے کو کیسی اچھی نصیحت کی ہے کہ بیٹے! بدن کے خون کا ایک قطرہ خالص لعل سے بہتر ہوتا ہے مجھے بوڑھے بازوں کی یہ نصیحت یاد ہے کہ کسی درخت پر آشیانہ نہ بنانا۔ ہم گھر نہیں بناتے، نہ باغ میں نہ جنگل میں۔ ہمارے لیے تو پہاڑ اور صحرا جنت ہیں۔ زمین پر سے دانہ چگنا گناہ ہے۔ خدا نے ہم کو آسمان کی وسیع فضا عطا کی ہے۔ جس اصیل باز نے زمین کو چھُوا۔ وہ گھریلو مُرغ سے بھی زیادہ کمینہ اور گرے ہوئے درجے کا ہو گیا۔ شاہبازوں کے لیے پتھر فرش کا کام دیتا ہے۔ کیونکہ وہ پتھر پر چل کر اپنے پنجے تیز کرتے ہیں۔ تو جنگل کے اُن زرد آنکھوں والے بازوں سے تعلق

رکھتا ہے جو لڑائی کے وقت چیتے کی آنکھوں سے پتلی نکال لیتے ہیں ۔ اُس کی آخری نصیحت یہ ہے کہ اس آسمان کے نیچے نرم و سخت جو بھی تجھے میسر ہو کھا لے مگر دوسروں سے اپنی غذا نہ لے اور نیک رہ اور نیک لوگوں کی نصیحت قبول کر کے اُس پر عمل کرتا رہ ۔

۱۔ اقبال نے "باز اپنے بچے کو نصیحت کرتا ہے" کے عنوان سے ایک نظم اپنی مشہور کتاب "پیامِ مشرق" میں لکھی ہے۔ "پیامِ مشرق" فارسی زبان میں ہے۔ ہم نے اُس کے خاص خاص حصّوں کا آسان اُردو میں ترجمہ کر لیا ہے ۔ تاکہ تم اس سے فائدہ اٹھا سکو۔

۲۔ یہ نظم اقبال نے اس لیے لکھی ہے کہ شاہین، باز اور عقاب جیسے پرندوں کو وہ بہت پسند کرتے ہیں ۔ کیونکہ ان میں بعض بڑی اعلیٰ درجے کی خوبیاں پائی جاتی ہیں مثلاً خوددار اور غیرت مند ہوتے ہیں . . . . آشیانہ نہیں بناتے ۔ بلند پرواز ہوتے ہیں ۔ اور تیز نگاہ ہوتے ہیں اور یہی صفات مومن میں ہوتی ہیں ۔ اسی لیے اقبال مسلمان کو شاہین، عقاب اور باز اور مسلمان بچوں کو شاہین بچے کہتے ہیں ۔ اس نظم کے ذریعے وہ بچوں کو یہ بات سمجھانا چاہتے ہیں کہ وہ شاہین بچے ہیں ان کو اپنے اندر شاہین اور عقاب کی سی خوبیاں پیدا کرنی چاہئیں ۔

مشق

۳۔ الفاظ کے معنی یاد کرو۔

لفظ	معنی	لفظ	معنی
جرأت	ہمت	آلودہ کرنا	خراب کرنا ، گندہ کرنا
حمیت	غیرت	تنومند	ہٹا کٹا ، طاقتور
تورنگ	ایک جنگلی مُرغ	آشیانہ	گھونسلا
کمینہ خصلت	گھٹیا عادتوں والا	سِفلہ	کمینہ

لفظ	معنی	لفظ	معنی
سارنگ	سیاہ رنگ کا پرندہ، دلکش آواز والا۔ جو سفید دھبے رکھتا ہے	مردار خور	مرے ہوئے جانوروں کو کھانے والا۔
بلند پرواز	بلندی پر اُڑنے والا	صفات	خوبیاں

۴ نیچے دیئے ہوئے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔
حمیت ۔ کمینہ خصلت ۔ آلودہ کرنا ۔ تنومند ۔ صفات

۵۔ نیچے لکھے ہوئے جملوں میں خالی جگہ کو پُر کرو۔
(الف) قوی ۔ سخت اور تنومند آدمی . . . . . رہتا ہے
(ب) باز اور شاہین . . . . . نہیں بناتے ۔
(ج) باز اپنی غذا . . . . . حاصل نہیں کرتا۔

۱۴۔ طفلِ شیر خوار (دودھ پیتا بچہ)

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو
مہرباں ہوں میں، مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو

پھر پڑا روئے گا اے نو وارد اقلیم غم!
چُبھ نہ جائے دیکھنا! باریک ہے نوکِ قلم

آہ! کیوں دکھ دینے والی شے سے تجھ کو پیار ہے
کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے، یہ بے آزار ہے

گیند ہے تیری کہاں؟ چینی کی بلی ہے کدھر؟
وہ ذرا سا جانور، ٹوٹا ہوا ہے جس کا سر

تیرا آئینہ تھا آزادِ غبار آرزو
آنکھ کھلتے ہی چمک اٹھا شرار آرزو

ہاتھ کی جنبش میں طرزِ دید میں پوشیدہ ہے
تیری صورت، آرزو بھی تیری نوزائیدہ ہے

زندگانی ہے تری آزادِ قید امتیاز
تیری آنکھوں پر ہویدا ہے مگر قدرت کا راز

جب کسی شے پر بگڑ کر مجھ سے چلاتا ہے تو
کیا تماشا ہے ردی کاغذ سے من جاتا ہے تو

آہ! اس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی ترا
تو تلون آشنا، میں بھی تلون آشنا

عارضی لذت کا شیدائی ہوں چلاتا ہوں میں
جلد آجاتا ہے غصّہ، جلد من جاتا ہوں میں

میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حُسن ظاہری
کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی میری۔

تیری صورت گاہ گریاں، گاہ خنداں میں بھی ہوں
دیکھنے کو نوجواں ہوں، طفلِ ناداں میں بھی ہوں

نظم کا مطلب یہ ہے:۔

اے بچے میں نے تجھ سے چاقو چھین لیا ہے تو اس پر تو روتا ہے! میں تجھ پہ مہربان ہوں اور تو مجھے نامہربان سمجھتا ہے! (چاقو اس لیئے چھینا ہے کہ کہیں اس سے تیرا ہاتھ نہ کٹ جائے!)

قلم کی نوک بھی باریک ہے، اس سے بھی ہوشیار رہنا! اگر چبھ گئی تو پھر روئے چلائے گا۔

اے بچے! آخر تجھے دکھ دینے والی چیز ہی سے پیار کیوں ہے؟ یہ کاغذ کا ٹکڑا ہے اس سے کھیل، یہ تکلیف دینے والا نہیں ہے۔ اپنی گیند سے کھیل، اپنی چینی کی بلّی سے کھیل یہ چیزیں تکلیف دینے والی نہیں ہیں۔ ان سے کیوں نہیں کھیلتا؟

اے بچے! جب تک تو ماں کے پیٹ میں تھا، تو ہر قسم کی آرزو اور خواہش سے پاک تھا۔ لیکن دنیا میں آتے ہی تیرے اندر آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک طوفان آگیا۔ اور اب یہ آرزوئیں طرح طرح سے ظاہر ہو رہی ہے۔ کبھی ہاتھ کی حرکت سے ظاہر ہوتی ہے کبھی ایک خاص انداز کے ساتھ دیکھنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ تیری طرح تیری آرزو بھی نوزائیدہ (بچہ) ہے۔

اے بچے! تیری زندگی اچھے برے کی تمیز سے آزاد ہے، اسی لیے تو ہر چیز سے خوش ہو جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے تجھ کو قدرت کا راز معلوم ہے۔ قدرت بھی امتیاز نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب تو کسی بات پر ناراض ہو کر روتا چلاتا ہے تو ایک معمولی سے کاغذ کے ٹکڑے ہی سے بہل جاتا ہے۔

آہ! یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ کبھی خوش ہے اور کبھی ناخوش، میں بھی، اس عادت میں تیرے ساتھ شریک ہوں میں بھی عارضی لذت پر جان دیتا ہوں۔ اور اس کے نہ ملنے پر روتا چلاتا ہوں اور مل جانے پر خوش ہو جاتا ہوں یعنی جیسا تلون تیری طبیعت میں ہے کہ تو کبھی ایک چیز کی تمنا کرتا ہے کبھی دوسری کی، ایسا ہی تلون میری طبیعت میں ہے۔ میں بھی ابھی ایک چیز سے خوش ہوں تو تھوڑی دیر میں کسی دوسری چیز کی آرزو کرنے لگتا ہوں۔ اور تیری طرح میری آنکھوں کو بھی ظاہری حسن لبھا لیتا ہے۔ اس طرح میری نادانی بھی تیری نادانی سے کم نہیں ہے۔ تیری طرح میں بھی کبھی روتا ہوں اور کبھی ہنستا ہوں۔ گویا دیکھنے میں نوجوان ہوں حقیقت میں میں بھی طفلِ نادان ہی ہوں۔

۱۔ اس نظم میں اقبال نے بچے کی ذہنی حالت بیان کی ہے کہ وہ اچھے بُرے کی تمیز نہ رکھنے کی وجہ سے تکلیف دینے والی چیزوں سے بھی کھیلنے لگتا ہے، معمولی چیز سے بہل جاتا ہے دوسری بات یہ کہ اس کی طبیعت میں تلوّن پایا جاتا ہے وہ کبھی کسی چیز کی آرزو کرتا ہے تو کبھی کسی اور چیز کی۔

بچے کی ذہنی حالت بیان کرنے کے بعد یہ بتایا ہے کہ نوجوان بھی طفلِ شیر خوار ہی طرح تلوں مزاج ہوتے۔ یہ بھی کبھی ایک چیز کی تمنا کرتے ہیں تو کبھی دوسری چیز کے لیے بے چین ہونے لگتے ہیں۔ عام طور پر بچوں کو نادان کہا جاتا ہے لیکن غور سے دیکھئے تو نوجوان اور بوڑھے بھی نادانی میں بچوں سے کم نہیں ہوتے۔ وہ بھی بچوں کی طرح عارضی لذت کے شیدائی اور ظاہری حسن کے چاہنے والے ہوتے ہیں۔ اور فانی چیزوں کے حاصل کرنے کے خیال میں مگن رہتے ہیں۔

مشق

۲۔ اقبال نے بچے کی ذہنی حالت کیا بتائی ہے؟

۳۔ اقبال نے بچے اور جوان کو نادانی میں ایک سا کیسے قرار دیا ہے؟

۴۔ نیچے دیئے ہوئے الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔

بے آزار۔ جنبش۔ تلوّن۔ شرار

۵۔ الفاظ کے معنی یاد کرو۔

لفظ	معنی	لفظ	معنی
شے	چیز	آئینہ	یہاں دل مراد ہے
طرزِ دید	دیکھنے کا انداز	شرار	تپنگا
نوزائیدہ	جو ابھی ابھی پیدا ہوا ہو	ہم آہنگ	متفق
بے آزار	جو تکلیف نہ دے	تلوّن	ایک حال پر قائم نہ رہنا۔

۱۵۔ مذہب

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

اُن کی جمعیّت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اقبال نے اس نظم میں یورپ کی قوموں اور مسلمانوں کے درمیان فرق بتایا ہے مسلمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں

اے مسلمان ! اپنی قوم کو یورپ کی قوموں جیسا نہ سمجھ ۔ اُن میں اور تیری قوم میں بڑا فرق ہے ! مسلمان قوم دوسری قوموں سے اس لیے مختلف ہے کہ یورپ کی قوموں کا اتحاد ملک و ملت، وطن اور رنگ و نسل وغیرہ سے قائم ہے اور مسلمانوں کا اتحاد مذہب کے ذریعے قائم ہوتا ہے ۔ یعنی دنیا بھر کے مسلمان دین کے رشتے کی وجہ سے بھائی بھائی ہیں ۔ مسلمانوں نے اگر دین کو چھوڑ دیا تو ان کا قومی اتحاد بھی ختم ہو جائے گا اور جب اتحاد ختم ہو گیا تو قوم بھی باقی نہ رہے گی

غرضکہ یورپ والوں کی دیکھا دیکھی ہم کو وطن اور رنگ و نسل وغیرہ پر فخر نہیں کرنا چاہیئے بلکہ دین اسلام پر فخر کرنا چاہیئے اور دین ہی کے ذریعے اپنے اندر اتحاد پیدا کر کے اپنی قوم کو مضبوط بنانا چاہیئے ۔

مشق

۱۔ اس نظم کو زبانی یاد کرو ۔

۲۔ مسلمانوں اور دوسری قوموں میں کیا فرق ہے ؟

۳۔ الفاظ کے معنی یاد کرو

لفظ	معنی	لفظ	معنی
ملت	قوم	رسولؐ ہاشمی	محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو قبیلہ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے
قیاس کرنا	سمجھنا		
اقوام مغرب	یورپ کی قومیں		
قومِ رسولؐ ہاشمی	مسلمان	جمعیّت	قومی اتحاد

۱۶۔ کافر و مومن

کافر ہو تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

۱۔ کافر تلوار پر بھروسہ کرتا ہے وہ بغیر تلوار کے نہیں لڑ سکتا۔ کیونکہ اس کو خدا پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ اور مومن بغیر تلوار کے بھی لڑتا ہے، اس لیے کہ اُس کو خدا پر بھروسہ ہوتا ہے کہ خدا چاہے تو بغیر تلوار کے بھی فتح مند کر سکتا ہے۔ اور تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ تعداد میں کم اور نہتے مسلمان کافروں کی بھاری جمعیت پر جو ہتھیاروں سے بھی لیس تھی، غالب آئے ہیں۔ بلکہ بعض موقعوں پر تو مسلمان نے کافر کو اپنی تلوار دیدی۔ اور خود بغیر تلوار کے لڑ کر فتح حاصل کی۔

۲۔ اگر مسلمان خدا کا نافرمان ہو گیا یا اُس کا خدا پر ایمان نہیں رہا تو پھر نہ اس کی قسمت میں فقیری ہے نہ بادشاہی اور اگر اس کا خدا پر ویسا ہی ایمان ہے جیسا ایک مسلمان کا ہونا چاہیئے تو وہ فقیری میں بھی بادشاہی کرتا ہے۔ چنانچہ بہت سے درویشوں کے حالات سے ثابت ہے کہ عوام تو عوام بادشاہ بھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کی خدمت میں نیازمندوں کی طرح حاضر ہوتے تھے۔

۳۔ اگر مسلمان نافرمان ہے تو خدا کی تقدیر کے تابع ہوتا ہے، یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ خدا نے ازل میں اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے وہی ہوگا۔ محنت اور کوشش کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اس لیے وہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہتا ہے۔ اور کچھ نہیں کرتا اور اگر مومن ہے تو

وہ خود ہی تقدیر الٰہی ہوتا ہے۔ یعنی اپنی کوشش۔ محنت اور تدبیر سے جیسا چاہتا ہے ویسا ہی اپنے آپ کو بنا لیتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ تقدیر پہلے سے بنی بنائی کوئی چیز نہیں ہے عمل سے بنتی ہے انسان اپنے عمل محنت اور کوشش سے اپنی تقدیر بھی بدل سکتا ہے۔

مشق

۱۔ ان اشعار کو زبانی یاد کرو اور صاف اور خوشخط اپنی کاپی میں بھی لکھ لو۔

۲۔ کافر تلوار پر بھروسہ کس لیے کرتا ہے اور مومن بغیر تلوار کے بھی لڑنے کے لیے کیوں تیار ہو جاتا ہے؟

۳۔ کیا تقدیر پہلے سے بنا دی گئی ہے اور اس وجہ سے انسان کو دوڑ دھوپ نہیں کرنی چاہیے۔

۴۔ نیچے لکھے ہوئے مصرعوں کو پورا کرو۔

(الف) کافر ہے تو . . . . . کرتا ہے بھروسہ۔

(ب) مومن ہے تو . . . . . لڑتا ہے سپاہی۔

(ج) مومن ہے تو . . . . . شاہی۔

۵۔ الفاظ کے معنی یاد کرو۔

لفظ	معنی	لفظ	معنی
تابع	فرمانبردار	فقیر	درویش، اللہ والا
شمشیر	تلوار		

۱۷ محرابِ گل افغان کے افکار

نظم

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان　　تو بھی اے فرزند کہستاں! اپنی خودی پہچان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز　　جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان!

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

اُونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا!　　جس کی ہوائیں تیز نہیں ہیں وہ کیسا طوفان!

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ　　اُس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان!

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج!　　عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان!

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

اقبال نے اپنی کتاب "ضربِ کلیم" میں محرابِ گُل افغان کے خیالات نظم کیے ہیں۔ محرابِ گُل افغان اپنے افغان بھائیوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے دنیا کی

دوسری قوموں کی صف میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کو اپنے بھائیوں کی غفلت پر بڑا افسوس ہے۔

اس نظم میں اقبال نے محراب گلؒ افغان کی زبانی سرحد کے افغانوں کو انقلاب کا پیغام دیا ہے، سرحد یعنی آزاد علاقے کے افغانوں میں وہ خوبیاں موجود ہیں، جن کی اگر صحیح تربیت کی جائے تو یہ اپنے آپ کو بدل کر اپنے لیے ایک اونچا مقام حاصل کر سکتے ہیں ان میں دینی حمیت بہت ہے، اپنے دل میں جہاد کا جذبہ دوسروں کی بہ نسبت بہت زیادہ رکھتے ہیں۔ فطرتاً بہادر ہیں اور جفاکش بھی ہیں اور انگریز اور انگریزیت دونوں سے سخت نفرت رکھتے ہیں۔

اقبال چونکہ ان کی ان خوبیوں سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے انہوں نے اس نظم میں ان کو غفلت سے بیدار ہونے اور اپنے آپ کو بدلنے کی نصیحت کی ہے۔

پہلے بند میں فرماتے ہیں کہ اے سرحد کے افغان! اپنے آس پاس کی دنیا کو دیکھ ہر طرف انقلاب آیا ہوا ہے، ترک بھی بدل گئے، شامی بھی بدل گئے۔ اور ہندوستان بھی بدل گیا۔ اللہ نے تیرے اندر بڑی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ تو بھی اپنی ذاتی صلاحیتوں کو پہچان اور اُن سے کام لے کر اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کر۔

دوسرا بند :-

اگر موسم بھی اچھا ہو، پانی بھی کثیر ہو اور مٹی بھی زرخیز ہو۔ پھر بھی کوئی دہقان اپنے کھیت کو نہ سینچے تو وہ کیسا دہقان ہے! اس کو دہقان کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ یعنی جب تمہیں خدا نے ایسی اچھی صلاحیتیں دی ہیں اور پھر ہر قسم کے قدرتی وسائل بھی مہیا کیے ہیں۔ یعنی اچھی آب و ہوا۔ پانی کی کثرت، زرخیز مٹی وغیرہ۔ تو پھر تم غفلت میں کیوں پڑے ہو۔ تم بھی اپنے آپ کو پہچانو اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے نہ رہو۔

تیسرا بند :-

تم تو سمندر ہو (بڑے عالی ظرف اور بلند حوصلہ والے) پھر کیا وجہ ہے۔ کہ

تمہارے اندر جوش و خروش نہیں ہے ؟ تم تو طوفان ہو (بڑے مستعد، جفاکش اور بہادر) پھر تمہاری رگوں میں ایسی سُستی کیوں ہے ؟ غافل افغانو ! اپنے آپ کو پہچانو اور اس غفلت کی نیند سے بیدار ہو کر اپنے موجودہ حالات کو بدلو۔

چوتھا بند۔

یاد رکھو ! جس نے اپنی ذات میں غوطہ لگا کر اپنی صلاحیتوں کو پہچان لیا اور ان کی قدر کی۔ ایسے دہقان کے مقابلے میں سلطان بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس لیے اے غافل افغان ! اپنے آپ کو پہچان، یعنی اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے۔

پانچواں بند :۔

یہ سچ ہے کہ تیرے علاقے میں علم و حکمت کی روشنی نہیں پہنچی ہے۔ لیکن تیری، بے علمی ہندوستان کے اُن عُلما کے علم و فضل سے بہتر ہے جو اپنی خودی کو بیچ رہے ہیں کوئی ہندو کا ساتھ دے رہا ہے اور کوئی انگریز کا غلام بنا ہوا ہے۔ اور ہندو اور انگریز ان سے جو کام لینا چاہتے ہیں لے لیتے ہیں۔

بہرحال اے افغان ! اپنی غفلت سے باز آ اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور قدرتی وسائل کی قدر کر اور ان سے کام لیتے ہوئے اپنی موجودہ قابل افسوس حالت کو بدل اور ترقی کی راہ پر چل۔

مشق

۱۔ آزاد علاقے کے افغانوں کی وہ خصوصیات کیا ہیں جن کی وجہ سے اقبال نے ان کو خاص طور پر خطاب کیا ہے ؟

۲۔ آزاد علاقے میں علم و حکمت کی روشنی نہ پہنچنے کے باوجود اقبال نے اس علاقے کے لوگوں کی کس بات کی تعریف کی ہے اور علماء کے مقابلے میں بھی ان کو اچھا کیوں بتایا ہے ؟

۳۔ نیچے دیئے ہوئے دونوں بند اپنی کاپی میں صاف صاف اور خوشخط نقل کرو۔

موسم اچھا ، پانی وافر ، مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان!

دھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ
اُس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان!

اپنی خودی پہچان!
او غافل افغان!

۱۸۔ اقبال اور اُن کے استاد

۱۔ مولوی سیّد میر حسن :

سیالکوٹ میں ایک کالج تھا جس میں ایک بزرگ مولوی سید میر حسن شاہ علوم مشرقی (عربی و فارسی) پڑھاتے تھے۔ ان کی تعلیم میں یہ خاص بات تھی کہ جو کوئی ان سے عربی یا فارسی پڑھتا وہ اس کی طبیعت میں اُس زبان کے ساتھ دلچسپی پیدا کر دیتے تھے۔ اور جو کچھ بتا دیتے وہ دلوں پر نقش ہو جاتا تھا۔ اقبال کو ابتدائی عمر میں مولوی سید میر حسن سا اُستاد مِلا طبیعت میں علم حاصل کرنے کا شوق قدرتی طور پر موجود تھا۔ فارسی اور عربی مولوی صاحب مرحوم سے پڑھی۔ پھر کیا تھا۔ سونے پہ سہاگہ ہو گیا۔ مولوی صاحب نے شاگرد کے شوق اور ذہن کی خوبیوں سے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکا آگے چل کر بڑا نام پیدا کرے گا۔ اس لیے بڑی محنت سے پڑھانے لگے شاگرد کا شوق اور سُوجھ بُوجھ دیکھ کر مولوی صاحب بہت خوش ہوتے تھے۔ مولوی صاحب کے سیکڑوں شاگرد تھے مگر وہ سب سے زیادہ اقبال پر مہربان تھے۔ کیوں نہ ہوتے؟ اُن کے شاگردوں میں کون ایسا تھا جو شوق اور ذہانت میں اقبال کا مقابلہ کر سکتا۔ کہ اِدھر مولوی صاحب کی زبان سے کوئی بات نکلتی تھی اور اُدھر اُن کا ذہن بجلی کی سی تیزی سے اُس کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا جبکہ دوسروں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا۔

اقبال بھی اپنے استاد کی بڑی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ جب گورنمنٹ نے اُنہیں سر کا خطاب دینا چاہا تو انہوں نے کہا کہ مجھے یہ خطاب اس شرط پر منظور ہے کہ میرے استاد کو شمس العلما بنا دیا جائے۔ اور جب گورنر نے کہا کہ میں نے ان کا نام آج پہلی دفعہ سنا ہے۔ کیا انہوں نے کچھ کتابیں لکھی ہیں؟ تو علامہ اقبال نے

فرمایا کہ انہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ لیکن میں اُن کی زندہ کتاب آپ کے سامنے موجود ہوں۔ وہ میرے استادِ محترم ہیں۔ چنانچہ مولوی میر حسن شمس العلماء ہوگئے۔

اقبال نے انگلستان جاتے ہوئے جو نظم حضرت خواجہ نظام اولیاء کی درگاہ پر پڑھی تھی اُس میں بھی جہاں اپنے ماں باپ اور بڑے بھائی کا ذکر کیا ہے وہاں مولوی صاحب کے متعلق کہا ہے کہ:۔

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمین کرے پھر اُس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

اُستاد کی عظمت کے بارے میں یہ واقعہ بڑا سبق آموز ہے۔

۱۹۱۳ء کا ذکر ہے کہ سید محمد عبد اللہ ان سے ملنے گئے تو وہ فرمانے لگے۔

عبداللہ جی! یورپ کا کوئی ایسا بڑا عالم یا فلسفی نہیں ہے، جس سے میں نہ ملا ہوں اور کسی نہ کسی موضوع پر بے جھجک بات نہ کی ہو لیکن، نہ جانے کیا بات ہے کہ شاہ جی، (میر حسن مرحوم) کے آگے میرے منہ سے بات نہیں نکلتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کے کسی نقطۂ نظر سے مجھے اختلاف ہوتا ہے۔ لیکن دل کی بات بآسانی زبان پر نہیں لا سکتا۔

ایک بار اقبال کو یہ کہتے بھی سنا گیا کہ شاہ جی کا کیا کہنا! شاہ جی کی ہر بات شعر ہوتی ہے ان باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال اپنے استاد مولوی سیّد میر حسن شاہ کا کس قدر احترام کرتے تھے اور ان کے لیے ان کے دل میں کتنی محبت عظمت اور عقیدت تھی[1]

۲۔ نواب مرزا داغ دہلوی۔

اقبال ابھی اسکول ہی میں پڑھتے تھے کہ کلامِ موزوں زبان سے نکلنے لگا، پنجاب

---

[1] روزگارِ فقیر حصّہ اول۔

میں اُردو کا رواج اس قدر ہو گیا تھا کہ ہر شہر میں اردو زبان اور شاعری کا چرچا کم و بیش موجود تھا۔ سیالکوٹ میں اقبال کی طالب علمی کے دنوں میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوتا تھا۔ اقبال نے اس مشاعرے کے لیے بھی کبھی کبھار غزل لکھنی شروع کر دی۔

اُردو کے شاعروں میں ان دنوں نواب مرزا داغ دہلوی کی بڑی شہرت تھی اور نواب دکن کے استاد ہونے کی وجہ سے ان کی شہرت ۔ اور بھی بڑھ گئی تھی لوگ جو ان کے پاس جا نہیں سکتے تھے۔ خط و کتابت کے ذریعہ سے ان کی شاگردی اختیار کرتے۔ غزلیں ڈاک سے ان کے پاس جاتی تھیں اور وہ اصلاح کے بعد واپس بھیج دیتے اقبال نے بھی انہیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں۔ اس طرح اقبال کو اردو زبان سیکھنے کے لیے بھی ایسے استاد سے نسبت حاصل ہوئی جسے اپنے وقت میں زبان کی خوبی کے لحاظ سے غزل کے فن میں یکتا سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ اُس ابتدائی غزل گوئی میں وہ باتیں موجود نہ تھیں جن کی وجہ سے کلامِ اقبال نے بعد میں شہرت پائی۔ مگر مرزا داغ پہچان گئے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ شہر کا یہ طالب علم کوئی معمولی غزل گو نہیں۔ انہوں نے جلد کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے چنانچہ شاگردی استادی کا تعلق ۔ ۔ ۔ ۔ زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ مگر اقبال کے دل میں داغ سے اس مختصر اور غائبانہ تعلق کی بھی بڑی قدر تھی۔ اپنے استاد کی شاعری اور زبان دانی پر فخر کیا کرتے تھے اور جب داغ کا انتقال ہوا تو ان کا ایسا پر درد مرثیہ لکھا جس میں ان کے کمالاتِ شاعری کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ اور اُن کے انتقال پر اپنے صدمے کا بڑے موثر الفاظ میں ذکر کیا ہے اور ان کے انتقال کو اُردو زبان اور شاعری کے لیے نقصانِ عظیم قرار دیا ہے۔ یہ مرثیہ اُردو کے بہترین مرثیوں میں شمار ہوتا ہے۔

۳ مسٹر آرنلڈ

سیالکوٹ کے کالج میں ایف اے کے درجے تک تعلیم تھی۔ بی۔ اے کے لیے

۱۔ مقدمہ بانگ درا۔

اقبال کو لاہور آنا پڑا۔ ان کی طبیعت کو فلسفہ سے خاص لگاؤ تھا۔ اور لاہور کے استادوں میں انہیں ایک نہایت شفیق استاد مل گئے۔ جنہوں نے فلسفہ کے ساتھ ان کی طبیعت کا لگاؤ دیکھ کر انہیں خاص توجہ سے پڑھانا شروع کیا۔ پروفیسر آرنلڈ جو بعد میں سر ٹامس آرنلڈ بن گئے۔ غیر معمولی قابلیت کے مالک تھے اور فلسفہ میں کمال رکھتے تھے اور علمی جستجو اور تلاش کے نئے طریقوں سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے چاہا کہ اپنے شاگرد کو اپنے مذاق اور طرزِ عمل سے مستفید کریں اور وہ اس ارادے میں کامیاب رہے۔ جب وہ اپنی ملازمت کی مدت پوری کر کے واپس انگلستان چلے گئے۔ تو اُس کا اقبال کو بڑا رنج ہوا۔ چنانچہ ان کی یاد میں ایک نظم لکھی جو "نالہ فراق" کے نام سے "بانگ درا" میں شامل ہے۔ اس نظم میں اقبال نے مسٹر آرنلڈ کی تعریف کی ہے۔ اور اپنے عقیدت مندانہ جذبات کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ اور اس بات پر اپنے دکھ کا اظہار کیا ہے کہ وہ ابھی فلسفہ میں درجۂ کمال کو نہیں پہنچے تھے کہ استاد کے فیضِ تعلیم سے محروم ہو گئے۔ اور بالآخر یہی شوقِ علم اُن کو استاد کے پیچھے پیچھے انگلستان لے گیا اور وہاں یہ رشتہ استادی شاگردی اور بھی مضبوط ہو گیا۔ آرنلڈ صاحب خوش تھے کہ ان کی محنت ٹھکانے لگی اور ان کا شاگرد علمی دنیا میں ان کے لیے شہرت کا باعث ہوا۔ اور اقبال کو اقرار تھا کہ جس مذاق کی بنیاد سید میر حسن نے رکھی تھی اس کے آخری مرحلے آرنلڈ صاحب کی مشفقانہ رہبری سے طے ہوئے اقبال نے اپنی نجی صحبتوں اور اپنی تحریروں میں اپنے استاد کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے اور ان کی شاگردی پر فخر کیا ہے اور آرنلڈ صاحب کہا کرتے تھے کہ ایسا شاگرد استاد کو محقق سے محقق تر کر دیتا ہے[1]

مشق

۱۔ داغ دہلوی کی شاگردی اقبال نے کس طرح اختیار کی؟۔

---

[1] ماخوذ از مقدمہ بانگ درا۔

۲۔ مولوی سید میر حسن مرحوم کو شمس العلما کا خطاب کس صلے میں ملا۔
۳۔ مسٹر آرنلڈ اقبال کے بارے میں کیا خیال رکھتے تھے۔
۴۔ الفاظ کے معنی یاد کرو۔

لفظ	معنی	لفظ	معنی
نفس	سانس	کلامِ موزوں	شعر
شفیق	مہربان	نقطۂ نظر	خیال
شادمان	خوش	نقصانِ عظیم	بہت بڑا نقصان
محقق	تحقیق کرنے والا	قلق	رنج

۱۹۔ اقبال کے لطائف

(ہنسنے ہنسانے کی باتیں)

اقبال کی طبیعت میں ظرافت اور خوش طبعی کا مادّہ بھی بلا کا تھا۔ خواہ کیسا مضمون ہو، وہ ہنسنے ہنسانے کا پہلو نکال لیا کرتے تھے۔

۱۔ فقیر سید وحید الدین مرحوم فرماتے ہیں۔

میرا طالب علمی کا زمانہ تھا کہ پہلی ہی ملاقات میں میں نے علاوہ اور باتوں کے حضرت علامہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ انگلستان پہنچ کر لوگ اپنے نام فرنگیانہ بنا لیتے ہیں آپ کو بھی چاہیئے تھا کہ اپنا نام "A.K. Ball" رکھ لیتے۔ اقبال نے بلا تامل جواب دیا بھئی ہم نے تو ایسا نہیں کیا مگر تم ولایت جاؤ تو اس نسخے پر ضرور عمل کرنا اور اپنا نام "W.A. Heed" رکھ لینا۔

میں اس جواب سے کچھ لاجواب سا ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد کسی بہانے سے وہاں سے کھسک آیا۔

(روزگارِ فقیر حصہ اول)

۲ ۔ عبداللہ چغتائی سے علامہ اقبال کو بڑا لگاؤ تھا۔ اُن کی ملاقات کے منتظر رہتے اور ان کی باتیں سنتے اور محفوظ ہوتے ۔ ایک بار چغتائی صاحب عرصے کے بعد علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ علامہ نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا ۔

"عبداللہ ! اتنے دنوں سے کہاں تھے ؟ ۔

چغتائی صاحب نے جواب دیا ۔

ڈاکٹر صاحب ! کیا عرض کروں ، آج کل اس قدر مصروفیت رہتی ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی ۔ اور فرصت ملتی ہے تو وقت نہیں ملتا ۔"

علامہ نے جواب پر بے اختیار قہقہہ لگایا اور فرمایا ۔

" عبداللہ ! تم نے آج وہ بات کہی ہے جو آئن سٹائن کے باپ کو بھی نہیں سوجھی ہوگی ۔

آئن سٹائن ۔ یورپ کا بہت بڑا فلسفی گزرا ہے اور وقت (Time) کے اپنے فلسفے کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتا ہے ۔

۲۰۔ شاہد اور عزیز کے درمیان گفتگو

شاہد اور عزیز گہرے دوست ہیں۔ روزانہ شام کے وقت ملا کرتے ہیں اور اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ کبھی شاعری پر کبھی ملک کے حالات پر۔ کبھی غالب اور حالی پر۔ کبھی قائداعظم اور پاکستان پر۔ غرض اس طرح دونوں دوست ایک دوسرے کے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ ایک ملاقات میں شاہد نے عزیز سے پوچھا کہ علامہ اقبال جو اتنے بڑے مفکر اور شاعر ہیں ان کا بچپن کیسا گزرا۔

عزیز نے شاہد کو تفصیل سے اقبال کے بچپن کے حالات سنائے۔ اُس نے اپنے دوست کو بتایا کہ

حالات تو بہت ہیں مگر وہ فی الحال چند خاص خاص باتیں ہی بیان کریں گے۔

اقبال نے اُس زمانے کے عام رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم مکتب میں پائی۔ اس کے بعد وہ انگریزی مدرسے میں داخل ہوئے۔ مکتب کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ ان کا دینی رنگ ایسا پختہ ہو گیا کہ تعلیم جدید کے تمام درجے طے کر لینے اور فلسفے میں کمال حاصل کرنے کے باوجود بھی وہ بڑے پکے مسلمان رہے۔

اقبال کو پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ کلاس میں استاد جو کچھ پڑھاتا وہ اسے بڑے غور سے سنتے اور اُسی وقت یاد کر لیتے۔ استاد ان کے ذہن کی تیزی اور علم حاصل کرنے کے شوق سے بہت خوش تھے۔ اور یہ ان کی محنت، ذہن کی تیزی اور شوق سے پڑھنے ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ ہر جماعت میں اول درجے میں کامیاب ہوئے، وظیفہ پایا اور تمغے حاصل کیے۔

اقبال کو قرآن کی تلاوت کا بڑا شوق تھا۔ بڑے دلکش لہجے میں اور اونچی آواز

سے ہر روز۔ صبح کے وقت قرآن پڑھا کرتے کہ جو سنتا اُس کا جی یہی چاہتا کہ بس سنتا ہی رہے۔ ان کے والد بھی بیٹے کو قرآن پڑھتے سنا کرتے اور بہت خوش ہوتے۔ ایک دن انہوں نے اقبال کو نصیحت کی کہ بیٹے! قرآن کو یہ سمجھ کر پڑھا کرو کہ یہ تم پر نازل ہو رہا ہے یعنی خدا تم سے خطاب کر رہا ہے۔ اقبال نے اس نصیحت پر بڑی سختی سے عمل کیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ اُس دن سے قرآن پڑھنے میں کچھ اور ہی لطف آتا ہے۔

اقبال بھی بچوں کی طرح کھیلتے تھے مگر اول تو شریفانہ کھیل کھیلتے دوسرے شریف اور اچھے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے۔ اور کھیلنے میں زیادہ وقت صرف نہیں کرتے تھے۔ زیادہ وقت وہ پڑھنے میں صرف کرتے۔ البتہ کبھی کبھی وہ کسی گہرے غور و فکر میں ایسے ڈوب جاتے کہ کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ یہ غور و فکر اس بات کی ابتدا تھی کہ وہ آگے چل کر ایک بہت بڑے فلسفی اور مفکر بننے والے تھے۔

ایک دفعہ بچپن میں انہوں نے کسی سائل کے لکڑی مار دی سائل ان کے دروازے سے کسی طرح ٹلتا نہیں تھا اس پر ان کو غصہ آگیا اور انہوں نے اُسے ایک لکڑی سے اس زور سے مارا کہ جو کچھ مانگ کر لایا تھا وہ بھی ہاتھ سے گر گیا۔ ان کے والد نے یہ بات دیکھ لی اُن کو اس سے بڑا دکھ ہوا اور نہایت درد بھرے الفاظ میں اُن کو خدا اور رسولؐ سے ڈرایا۔ باپ کی باتوں کا اقبال پر ایسا اثر ہوا کہ اُس دن کے بعد سے انہوں نے پھر کسی کو ایسی بات بھی نہیں کہی جو اس کی دل آزاری کا سبب ہو۔ وہ غریبوں اور درویشوں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔

اقبال کی ذہانت کے بارے میں ایک لطیفہ بھی مشہور ہے کہ کسی دن اتفاق سے وہ اسکول دیر سے پہونچے تو ان کے استاد نے اُن سے کہا،

اقبال تم ہمیشہ دیر سے آتے ہو اس پر اقبال نے فوراً جواب دیا۔ اقبال ہمیشہ دیر سے ہی آتا ہے۔

اقبال دیر سے نہیں آتے تھے۔ اتفاق سے کسی دن دیر ہوگئی تو استاد نے ان کی ذہانت آزمانے کے لیے خوش طبعی کے طور پر ایسا کہہ دیا۔ اقبال کا یہ جواب سُن کر

استاد اِن کی ذہانت اور حاضر جوابی سے بہت خوش ہوا اور اس نے سمجھ لیا کہ یہ لڑکا آگے چل کر ایک نام آور شخص بننے والا ہے۔

اقبال کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ صُبح بہت جلد سو کر اٹھتے تھے۔ فجر کی نماز پڑھتے اور اس کے بعد قرآن کی تلاوت کرتے ، تلاوت سے فارغ ہو کر کسی قدر، ورزش کرتے اور ناشتہ کر کے اسکول چلے جاتے۔ صبح جلدی اٹھنے کی عادت اُن میں ایسی پختہ ہو گئی تھی کہ جب وہ تین سال یورپ میں رہے تو وہاں بھی اس میں کوئی فرق نہ آیا۔ چنانچہ اپنی سحر خیزی کا انہوں نے جگہ جگہ اپنے کلام میں ذکر کیا ہے اور سحر خیزی کے فائدے بیان کیے ہیں۔

شاھد :۔ عزیز صاحب! واقعی آپ اقبال کے بارے میں بڑی معلومات رکھتے ہیں آج آپ نے بڑی مفید معلومات سے نوازا ہے۔ خدا کرے ہماری نئی نسل بھی اقبال کے بچپن کے واقعات سے سبق حاصل کرے۔ اچھا یہ تو بتائیے اقبال نے پاکستان کے قیام میں کیا حصہ لیا۔

عزیز :۔ صاحب یوں تو اقبال کے یورپ سے واپسی کے بعد کی تمام شاعری پاکستان کی تعمیر سے تعلق رکھتی ہے۔ کہیں نوجوانوں کو نصیحت ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانیں کہ وہ کیا ہیں اور کہیں بوڑھوں کو توجہ دلائی ہے کہ وہ نئی نسل کی تعلیم و تربیت اس طرح کریں کہ وہ صحیح معنی میں مسلمان ہو کر اپنے کھوئے ہوئے قومی مقام کو حاصل کر سکیں چنانچہ اُن کی سب سے پہلی فارسی کی کتابوں اسرار خودی اور رموزِ بیخودی کے پڑھنے سے ہمارے اس خیال کی تائید ہو جائے گی۔ مگر جب ۱۹۳۰ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی، جو الہٰ آباد میں ہوا تھا تو اپنے خطبۂ صدارت میں صاف صاف الفاظ میں اعلان فرما دیا کہ مسلمان، ہندوؤں کی فرقہ پرستی کی وجہ سے اُن کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ان کو اپنی اکثریت والے صوبوں میں اپنی علیٰحدہ مملکت قائم کرنی چاہیئے۔ چنانچہ علامہ اقبال کے اس خیال کی تکمیل قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں ہوئی اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان دنیا کے نقشہ پر نمودار ہو گیا۔

شاھد :۔ بہت بہت شکریہ عزیز صاحب ! بڑا کرم فرمایا۔ کسی دوسرے موقع پر پھر آپ کو تکلیف دوں گا اِن شاءاللہ۔ خدا حافظ !

مشق

الفاظ کے معنی یاد کرو۔

معنی	لفظ	معنی	لفظ
اُترنا	نازل ہونا	اقبال کو ماننے والا	اقبالی
شریفوں کا سا	شریفانہ	قاعدہ	رواج
سوال کرنے والا بھکاری	سائل	پکّا	پختہ
محبت	عقیدت	قرآن پڑھنا	تلاوت
بے ساختہ برمحل	برجستہ	لَے ، قرأت	لہجہ ، لے
تکلیف	زحمت	صبح جلدی اٹھنا	سحر خیزی
پورا ہونا	تکمیل	خراب جس میں نقص ہو	ناقص

۱۔ اقبال کے بچپن کے حالات میں سے کچھ واقعات اپنے الفاظ میں بیان کرو

۲۔ قرآن کی تلاوت کے بارے میں اقبال کے والد نے ان کو کیا نصیحت کی تھی۔

۳۔ کیا اقبال بچپن میں نہیں کھیلتے تھے ؟ اگر کھیلتے تھے تو ان میں اور دوسرے لڑکوں میں کیا فرق تھا؟

۴۔ نیچے لکھے ہوئے جملوں کو پورا کرو۔

(الف) بھلا کون سا پڑھا لکھا مسلمان ہے جس کو اقبال سے . . . .

(ب) بھی جب اقبال سے دلچسپی ہے تو اُن کا . . . .

(ج) اقبال کو قرآن کی تلاوت کا . . . .

۵۔ نیچے دیے ہوا الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔

شریفانہ ۔ اقبال مندی۔ سحر خیزی زحمت ۔ مطالعہ۔

۲۱۔ اقبال کے خاص خاص اشعار

اقبال کے وہ اشعار جو لوگوں کو زبانی یاد ہیں اور وہ بہت زیادہ پڑھے جاتے ہیں ان میں سے چند اشعار تم بھی یاد کر لو۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی　　یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو　　تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو ؟

حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی، ایک　　کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک ؟

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں　　یہ جہاں چیز ہے کیا ! لوح و قلم تیرے ہیں !

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم　　سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں　　گرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری　　صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن　　قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن !

سلسلۂ درسیاتِ اقبال

دوم

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	زندگی کے حالات	۱
۲	اقبال کی بعض خاص خاص باتیں۔	۶
۳	بچے کی دُعا	۱۱
۴	ایک پہاڑ اور گلہری	۱۳
۵	سلطان مُراد اور معمار	۱۵
۶	ہمدردی	۱۷
۷	پرندے کی فریاد	۱۹
۸	حکایت شیر اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ	۲۱
۹	مُرید ہندی اور پیر رومی	۲۳
۱۰	چاند اور تارے	۲۶
۱۱	ترانۂ ہندی	۲۹
۱۲	ایک تاریخی واقعہ	۳۱
۱۳	غنی کاشمیری	۳۴
۱۴	ایک گائے اور بکری	۳۵
۱۵	قیامِ پاکستان	۳۶
۱۶	حامد اور محمود کے درمیان مکالمہ	۴۴
۱۷	علامہ اقبال کے ارشادات	۶۰
۱۸	اقبال کی قابلِ رشک عادات	۶۴
۱۹	علامہ اقبال کے خطوط	۷۲
۲۰	اقبال کے لطائف	۷۸
۲۱	اقبال کے چند مخصوص اشعار	۸۱

۱۔ زندگی کے حالات

اقبال کشمیری پنڈتوں کے ایک پرانے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ڈھائی سو سال قبل ان کے بزرگوں میں ایک صاحب مسلمان ہوگئے تھے۔ بعد میں یہ خاندان راجاؤں کے ظلم سے تنگ آکر دوسرے بہت سے خاندانوں کی طرح کشمیر چھوڑ کر سیالکوٹ میں آباد ہوگیا۔

اقبال کے والد شیخ نور محمدؒ بڑے نیک اور اللہ والے بزرگ تھے۔ سیالکوٹ میں ان کا چھوٹا سا کاروبار تھا گو آمدنی قلیل تھی۔ مگر وہ اسی میں بڑے صبر و شکر کے ساتھ رہتے تھے۔ اقبال سیالکوٹ ہی میں ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ اُس زمانے کے قاعدے کے مطابق آپ نے مکتب سے تعلیم کا آغاز کیا۔ اُس کے بعد انگریزی مدرسے میں داخل ہوگئے۔ پانچویں جماعت کا امتحان وظیفے کے ساتھ پاس کیا۔ مڈل اور انٹرنس کے امتحان میں بھی وظیفہ حاصل کیا۔ آپ شروع ہی سے ذہانت کا پیکر تھے۔ جب آپ اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے تو مولانا سید میر حسن جیسے قابل اور مہربان استاد کی خاص توجہ اور تعلیم و تربیت نے آپ کی ذاتی خوبیوں کو چمکانے اور اُبھارنے میں بڑا کردار ادا کیا۔

سیالکوٹ سے ایف اے پاس کرنے کے بعد اقبال لاہور آگئے اور گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخل ہوئے۔ اور بی۔ اے کا امتحان بھی شاندار طریقے سے پاس کیا۔ بلکہ عربی اور انگریزی کے مضامین میں امتیاز حاصل کرنے کے سبب دو سونے کے تمغے بھی حاصل کیے اور وظیفہ بھی حاصل کیا۔ انہی دنوں آرنلڈ صاحب، علی گڑھ کالج سے گورنمنٹ کالج، لاہور آگئے۔ فلسفے میں کمال رکھنے کی وجہ سے آرنلڈ صاحب

کی دنیا بھر میں شہرت تھی۔ اُس شہرت نے اقبال کو اُن کا گرویدہ بنا دیا اور آرنلڈ صاحب بھی اقبال کی ذہانت اور فلسفیانہ دماغ کے قائل ہو گئے۔ اور اقبال کو بہت چاہنے لگے چنانچہ اقبال نے ایم۔ اے بھی پاس کر لیا اور ایک تمغہ بھی حاصل کیا۔

(ملازمت کا سلسلہ)

ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد اقبال گورنمنٹ کالج میں لیکچرر ہو گئے۔ علامہ کالج کے اوقات کے علاوہ بھی طالب علموں کو اپنے مکان پر پڑھایا کرتے تھے۔ اس طرح جب تک آپ طالب علم رہے، ایک نیک، سعادت مند، ذہین اور محنتی طالب علم رہے اور جب استاد ہوئے تو ایک شفیق اور مہربان استاد ثابت ہوئے۔

(ولایت کا سفر)

اقبال کو علم حاصل کرنے کا شوق حد سے زیادہ تھا۔ جب تک یہاں رہے تو بہت زیادہ کتابیں پڑھ کر اس شوق کو پورا کرتے رہے۔ لیکن طبیعت بھری نہیں آخر ۱۹۰۵ء میں ولایت کا سفر اختیار کیا اور صرف علم کی خاطر ماں باپ، بیوی بچوں، دوسرے رشتہ داروں اور دوستوں سے ہزاروں میل دُور کی جدائی اختیار کی، ہفتوں اور مہینوں کے لیے نہیں بلکہ پورے تین سال کے لیے! لندن میں کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفے کا امتحان پاس کرنے کے بعد جرمنی کی میونک یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جرمنی سے واپس آکر لندن میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

صرف ۳۲-۳۳ سال کی عمر میں اس قدر ڈگریاں حاصل کرنا اور فارسی، عربی سنسکرت کے علاوہ یورپ کی کئی زبانوں میں مہارت بہم پہنچانا اقبال جیسے شہہ دماغ ہی کا کام تھا۔ آخر آپ ۱۹۰۸ء میں وطن واپس تشریف لے آئے۔

(اقبال کی شاعری)

اقبال نے ایف اے کا امتحان مشن کالج سیالکوٹ سے پاس کیا تھا اور شاعری کی ابتدا بھی وہیں سے کی۔ لیکن آپ کے شاعرانہ جوہر لاہور میں آکر کھلے۔ علم کی روشنی اور لاہور کی سوسائٹی نے طبیعت کو ایسا چمکایا کہ ذرّہ آفتاب بن گیا۔ آپ کی شاعری کا چرچا شروع شروع میں آپ کے ہم جماعت طالب علموں تک ہی رہا۔ مگر کچھ ہی دنوں کے بعد اس محدود حلقے سے نکل کر دور دور پہنچنے لگا۔ مرزا داغ دہلوی کی اُس زمانے میں بڑی شہرت تھی۔ لوگ خط و کتابت کے ذریعے اُن کو اپنا کلام اصلاح کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ اقبال نے بھی ایسا ہی کیا۔ مگر یہ اصلاح کا سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہا۔ کیونکہ خود داغ نے کچھ غزلیں دیکھنے کے بعد لکھ بھیجا کہ آپ کے اشعار میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔

اس زمانہ تک اقبال غزلیں ہی کہتے رہے۔ چنانچہ آپ کے ابتدائی کلام میں زیادہ تر غزلیں ہی ملتی ہیں۔ لیکن یہ غزل گوئی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی آخر انہوں نے قوم کی طرف توجہ کی اور قومی نظمیں لکھنا شروع کیں۔ ۱۸۹۹ء میں "نالۂ یتیم" کے نام سے جو ایک نظم آپ نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھی اُس نے آپ کی شاعری اور علمی شہرت کو ہندوستان کی ہر علمی سوسائٹی تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد انجمن کے ہر سالانہ جلسے کے لیے اقبال کی نظم ضروری قرار پا گئی۔

اقبال نے وطن کی محبت کے جذبات سے بھرپور نظم "ہمالہ" کے نام سے لکھی۔ پھر ہندو مسلم اتحاد کے لیے کئی نظمیں لکھیں، "ہندی ترانہ" لکھا۔ ان تمام نظموں نے مُردہ دلوں میں جان ڈالدی ہندو اور مسلمان دونوں ہی نے ان کو پسند کیا۔

۱۹۱۰-۱۱ھ کا زمانہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے بڑی پریشانی اور آزمائش کا زمانہ تھا۔ بلقان کی جنگ اور طرابلس کی لڑائیوں میں مسلمانوں کا خون بہہ رہا تھا، اسلامی، خلافت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھنے اور اسلام کا سیاسی اقتدار مٹنے کو تھا جس نے ہر مسلمان

کو تڑپا دیا تھا۔ ایسے میں اقبال کے دل میں یہ تیر کیسے نہ لگتا اُن کے دل نے اس مصیبت کو سب سے زیادہ محسوس کیا۔ نظمیں لکھیں، سنائیں اور محفلوں میں شور و فغاں برپا کر دیا اب وہ "ترانہ ہندی" کی بجائے "ترانۂ ملی" لکھتے ہیں۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

وہ "وطنیت" کو اسلام کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ اب اقبال کے کلام کی شہرت دنیا بھر میں پھیل گئی خصوصاً اسلامی ملکوں میں ان کی نظموں کو بڑا قبولِ عام حاصل ہوا۔

(علالت اور وفات)

اقبال کو کچھ عرصے سے گُردے کی تکلیف تھی۔ علاج سے مرض کسی حد تک کم تو ہو گیا مگر پوری طرح دُور نہیں ہوا تھا۔ جلد ہی اس درد کے دورے پڑنے لگے۔ موت سے کوئی چار سال پہلے گلا خراب ہونے سے آواز بیٹھ گئی۔ اس کے علاج کے لیے وہ بھوپال گئے۔ کیونکہ وہاں بجلی کے ذریعے علاج کا بہت اچھا انتظام تھا۔ اس علاج سے فائدہ ہوا مگر بہت کم۔ وفات سے کوئی سال بھر پہلے ان کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا۔ کچھ دنوں بعد سانس بھی پھولنے لگی۔ اُٹھ کے غسل خانے تک جانا مشکل تھا۔ دسمبر ۱۹۳۷ء میں طبیعت زیادہ بگڑنے لگی دل بہت کمزور ہو گیا۔ کندھوں میں بھی درد ہو جاتا۔ غرضکہ چار سال کی لمبی علالت کے بعد علم و فضل کا یہ آفتاب ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن۔

(الفاظ کے معنی)

لفظ	معنی	لفظ	معنی
ذہانت	ذہن کی تیزی	اعزاز	عزت، مرتبہ
تربیت	دیکھ بھال کرنا، ادب سکھانا، تعلیم دینا۔	جوہر	کمال ہنر، ذاتی خوبی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
امتیاز	یہاں فرق کے معنی ہیں	اصلاح	درستی
گرویدہ	بہت چاہنے والا	اتحاد	میل جول
اوقات	وقت کی جمع	اِقتدار	حکومت، اختیار
علالت	بیماری		طاقت ۔

مشق

۱۔ اقبال کے خاندان کے بارے میں جو کچھ جانتے ہو ، بیان کرو

۲۔ اقبال کے والد کا نام کیا تھا؟ اُن کا مختصر حال دو ایک جملوں میں بیان کرو ۔

۳۔ اقبال کے اُستادوں کے نام بتاؤ اور ہر ایک کا مختصر حال بھی بیان کرو ۔

۴۔ اقبال شاعری میں اپنے اُستاد سے کس طرح اصلاح لیتے تھے ۔ اور اُن کے اُستاد نے اُن کی غزلیں دیکھ کر ان کے بارے میں کیا رائے قائم کی تھی ؟۔

۵۔ اقبال یورپ کب گئے اور وہاں سے واپس کب آئے ۔ یورپ میں انہوں نے کس یونیورسٹی میں تعلیم پائی ۔

۶۔ نیچے لکھے ہوئے جملوں میں خالی جگہ کو پُر کرو ۔

(الف) اقبال کشمیری پنڈتوں کے ایک . . . . . تعلق رکھتے ہیں ۔

(ب) اقبال نے شروع میں اُس زمانے کے قاعدے کے مطابق . . . . . پڑھا ۔

(ج) سیالکوٹ سے ایف ۔ اے پاس کرنے کے بعد اقبال . . . . . آگئے ۔

۷۔ ان جملوں کو صاف صاف اپنی کاپی میں نقل کرو ۔

(الف) اقبال کو علم حاصل کرنے کا شوق حد سے زیادہ تھا ۔

(ب) اقبال کے شاعرانہ جوہر لاہور میں آکر کھلے ۔

(ج) انجمن حمایت الاسلام لاہور کے ہر سالانہ جلسے میں اقبال کی نظم ضروری قرار پاگئی ۔

۲۔ اقبال کی بعض خاص خاص باتیں

۱۹۲۶ء میں اقبال نے دوستوں کے بار بار کہنے پر حامی بھر لی کہ وہ پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کے انتخاب میں حصہ لیں گے۔ جب یہ خبر عام ہوئی تو دو امیدواروں نے اپنے نام واپس لے لیے مگر تیسرا امیدوار آخر تک جما رہا۔ لاہور کے ہر محلّے میں اقبال کے نیازمندوں اور دوستوں نے جلسے کیے۔ شہر کی تمام برادریوں نے اُن کی حمایت میں بیانات دیئے۔ اور اشتہارات تقسیم کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال بہت زیادہ ووٹ حاصل کر کے کامیاب ہوئے اور ۲۳ نومبر ۱۹۲۸ء کو ایم۔ ایل۔ سی بن گئے۔

دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخری دنوں میں اسلامیات پر لکچر دینے کے لیے اقبال کو مدراس یونیورسٹی کی طرف سے دعوت دی گئی۔ آپ تشریف لے گئے اور تین دن وہاں قیام کیا۔ مختلف انجمنوں نے سپاسنامے پیش کیے اور دعوتیں دیں۔ مدراس، بنگلور اور میسور کے تقریباً تمام انگریزی، اُردو اور دوسری زبانوں کے اخباروں نے اداریے لکھے۔ اقبال کے فوٹو شائع کیے اور اُن کو خوش آمدید کہا۔ اخبارات کے نمائندوں اور مذہب و فلسفہ کے بڑے بڑے عالموں نے اُن سے مذہب، فلسفہ اور سیاسیات سے متعلق سوالات کیے۔

۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو جب اقبال بنگلور کے اسٹیشن پر پہنچے تو ہزاروں آدمی اُن کو دیکھنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے۔ یہاں بہت سی انجمنوں کی طرف سے اُن کی خدمت میں سپاسنامے پیش کیے گئے۔ میسور میں انہیں مہاراجہ کا دعوت نامہ ملا کہ وہ حکومت کے مہمان ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ۱۰ جنوری کو سرکاری مہمان خانے میں قیام کیا۔ میسور یونیورسٹی میں اُن کے لکچروں کا انتظام کیا گیا۔ دوسرے دن میسور کے مسلمانوں

نے اُن کو خوش آمدید کہا۔ اور سپاسنامہ پیش کیا۔ میسور، بنگلور، سرزگا پٹم اور دوسرے مقامات دیکھنے کے بعد وہ ۱۴ جنوری کو حیدر آباد پہنچے جہاں اسٹیشن پر مسلمان بچے ایک قطار میں کھڑے، جو اُن کا کہا ہوا قومی ترانہ، چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا" بڑی دلکش آواز میں گا رہے تھے۔ اسٹیشن پر عوام کے ساتھ ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی کے استاد اور دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ آپ نے حکومت کے مہمان کی حیثیت سے سرکاری مہمانے خانے میں قیام کیا۔ ۱۸ جنوری کی صبح کو انجے وہ اعلیٰ حضرت حضور نظام سے ملے۔ حیدر آباد، میسور اور مدراس کے اخباروں نے اُن کی علمی فضیلت پر مضامین شائع کیے اور بعض نے اقبال نمبر بھی نکالے۔

دسمبر ۱۹۳۰ء میں آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت فرمائی اور اس موقعے پر اپنے صدارتی خطبے میں پاکستان کا تصور پیش کیا۔ اقبال کا یہی وہ خواب تھا جس کی تعبیر بعد میں قائداعظم محمد علی جناح رح کے ہاتھوں ہوئی۔ اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آگیا۔

اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے جو لندن میں ۱۹۳۱ء میں ہوئی اور کانفرنس سے فارغ ہو کر لندن سے فلسطین پہنچے جہاں آپ کو مؤتمرِ عالم اسلامی میں ہندوستان کے مسلمانوں کی نمایندگی کے لیے بلایا گیا تھا۔

تیسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد اقبال پیرس تشریف لے گئے جہاں علمی حلقوں کے علاوہ انہوں نے فرانس کے مشہور فلسفی برگسان سے بھی ملاقات کی اور ان دونوں فلسفیوں کے درمیان نہایت اہم علمی مسائل پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد اقبال نے ہسپانیہ کا سفر کیا۔ میڈرڈ یونیورسٹی کے منتظمین نے اُن سے درخواست کی کہ "ہسپانیہ اور عالمِ اسلام کا ذہنی ارتقاء" کے موضوع پر لیکچر دیں۔ علامہ کا لیکچر بہت پسند کیا گیا۔ خاص طور پر پروفیسر آسین نے اقبال کی تعریف کا حق ادا کر دیا۔ اس سفر میں اقبال مسجد قرطبہ دیکھنے بھی گئے اور اس مسجد سے متعلق اپنے خیالات ایک نظم میں پیش کیے جو مسجد قرطبہ" کے عنوان سے ان کی کتاب بالِ جبریل میں موجود ہے اور

ان کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔

ہسپانیہ سے وہ اٹلی تشریف لے گئے۔ یہاں بھی علمی حلقوں نے اُن کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ڈاکٹر اسکارپانے، جو ہندوستان میں اٹلی کے سفیر رہ چکے تھے اور اقبال کے بڑے مداح تھے، کئی استقبالی تقریبوں کا انتظام کیا۔ اس کے علاوہ اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی نے خود ملاقات کی خواہش کر کے اقبال کو مدعو کیا۔ اور اقبال اس سے مل کر اُن کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اپنے اُن خیالات کو جو اس سے ملنے کے بعد اقبال کے دل میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایک نظم میں پیش کیا ہے جو مسولینی کے عنوان سے بالِ جبریل میں شامل ہے۔

۱۹۳۲ء میں اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے عام اجلاس کی صدارت کی اس کانفرنس میں اقبال نے جو صدارتی خطبہ پڑھا وہ بہت اہم تھا۔ اس میں انہوں نے گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے وفد کی کارگزاری سنائی اور گاندھی جی، مالوی جی اور ہندوؤں اور سکھوں کے دوسرے رہنماؤں کے ضدی رویے کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ اور صوبہ سرحد، عبدالغفار خاں، مسئلہ کشمیر، ہندو مسلم فسادات، اقلیتوں کے اندیشوں اور دوسرے مسائل کے بارے میں نہایت گہرے اور دور رس خیالات کا اظہار کیا۔

ماہ ستمبر ۱۹۳۳ء میں افغانستان کے بادشاہ، اعلیحضرت محمد نادر شاہ کی طرف سے علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کو دعوت نامہ ملا کہ یہ حضرات چند روز کے لیے افغانستان تشریف لائیں اور افغانستان کے وزیر تعلیم کو کابل میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے اور تعلیمات کو جدید اصولوں کے مطابق درست کرنے کے بارے میں مشورہ دیں۔ چنانچہ تینوں حضرات اکتوبر کے آخری ہفتے میں کابل پہنچ گئے۔ وہاں شاہی مہمان رہے۔ اعلیحضرت نادر شاہ سے ملاقات ہوئی اور افغانستان کے دوسرے امیروں، وزیروں اور کابل کے معزز لوگوں سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ "انجمن ادبی، کابل" نے افغانستان کے ادیبوں اور دانشوروں کے ایک شاندار جلسے میں معزز مہمانوں

کو سپاسنامہ پیش کیا۔

تین ہفتے کے قریب وہاں قیام کرنے کے بعد اقبال غزنی اور قندھار روانہ ہو گئے غزنی میں سلطان محمود غزنوی حکیم سنائی اور حضرت گنج بخش رح کے والد کے مزارات پر فاتحہ پڑھی۔ پھر قندھار پہنچ کر خرقہ شریف کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ اور قندھار سے ۲ نومبر کو صبح وطن واپس آنے کے لیے چل پڑے۔

(الفاظ کے معنی)

لفظ	معنی	لفظ	معنی
حمایت	طرفداری، مدد	مسائل	باتیں
تصوّر	خیال	ذہنی ارتقاء	ذہنی ترقی
وجود میں آگیا	بن گیا	تعریف کا حق ادا کر دیا	خوب تعریف کی
گرم جوشی	جوش اور محبت	مداح	تعریف کرنے والا

مشق

اقبال کی زندگی کے بارے میں نیچے لکھے ہوئے سوالوں کے جواب دو۔

(الف) اقبال نے کس انتخاب میں حصہ لیا؟ انتخاب کا نتیجہ کیا نکلا؟

(ب) اقبال کو مدراس یونیورسٹی نے کس لیے بلایا تھا؟ وہ اس سفر میں کہاں کہاں گئے؟

(ج) اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں لندن کے علاوہ کہاں کہاں گئے؟ اور انہوں نے کس کس بڑے آدمی سے ملاقات کی؟

(د) 'مسجدِ قرطبہ' کے دیکھنے کے بعد اقبال پر اس کا کیا اثر ہوا؟

۲۔ نیچے لکھے ہوئے جملوں میں خالی جگہ کو پُر کرو۔

(الف) پاکستان کا تصوّر . . . . . دیا۔

(ب) اقبال کا یہی وہ خواب تھا جس کی تعبیر بعد میں . . . . . ہاتھوں ہوئی۔
(ج) مسولینی نے خود ملاقات کی خواہش کر کے . . . . . مدعو کیا۔

۳۔ ذیل کے لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔

تصوّر ۔ حمایت ۔ کامیاب ۔ مدعو ۔ استقبال۔

۲۔ بچے کی دُعا

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری — زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے — ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب — علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا — دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو، اُس رہ پہ چلانا مجھ کو

(الفاظ کے معنی)

لفظ	معنی	لفظ	معنی
صورت	طرح، مانند، مثال	زینت	رونق، خوبصورتی
چمکنا	روشنی پھیلانا	حمایت	مدد، طرفداری
میرے چمکنے سے	میرے علم کی روشنی سے	ضعیف	کمزور

(نظم کا مقصد)

یہ بتایا ہے کہ بچے کی دُعا کیا ہونی چاہیئے۔ وہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے علم حاصل کر کے اپنے علم کی روشنی سے دنیا سے جہالت اور بُرائیوں کے اندھیرے

دور کرے ۔ اور اچھے کام کرکے اپنے ملک کی عزت اور رونق کا سبب بنے ۔ اور
غریبوں کی مدد کرے ، مصیبت زدوں ، کمزوروں کے کام آئے ۔
برائیوں سے خود بھی دور رہے ۔ اچھے کام کرے اور سیدھے راستے پر چلے ۔

مشق

۱۔ بچے نے اپنی دعا میں کس کس چیز کی تمنا کی ہے ؟
۲۔ دنیا کا اندھیرا کس طرح دور ہوتا ہے ۔ ؟

۳۔ خالی جگہوں میں لفظ لکھ کر نیچے لکھے ہوئے مصرعوں کو پورا کرو۔
(الف) لب پہ آتی ہے . . . . . تمنا میری ۔
(ب) دُور دنیا کا . . . . . اندھیرا ہو جائے ۔
(ج) جس طرح پھول سے ہوتی ہے . . . . . زینت ۔
(د) میرے اللہ ! . . . . . بچانا مجھ کو ۔

۴۔ جملے بناؤ اور ان میں نیچے دیئے ہوئے الفاظ استعمال کرو :۔
میرے دم سے ۔ غریبوں کی حمایت ۔ علم کی روشنی ۔

---

۴ - ایک پہاڑ اور گلہری

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے
ذرا سی چیز ہے، اس پر غرور کیا کہنا
یہ عقل اور یہ سمجھ، یہ شعور کیا کہنا
خدا کی شان ہے ناچیز، چیز بن بیٹھیں
جو بے شعور ہوں یوں، باتمیز بن بیٹھیں
تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے
جو بات مجھ میں ہے، تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں!
بھلا پہاڑ کہاں! جانور غریب کہاں!

کہا یہ سُن کے گلہری نے مُنہ سنبھال ذرا
یہ کچی باتیں ہیں، دل سے انہیں نکال ذرا
جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا
نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا کوئی چھوٹا، یہ اُس کی حکمت ہے
بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اُس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اُس نے
قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ کو
نری بڑائی ہے! خوبی ہے اور کیا تجھ میں
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دِکھا مجھ کو

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

الفاظ کے معنی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
بے شعور	بے وقوف، بے عقل	بساط	حیثیت،

لفظ	معنی	لفظ	معنی
باتمیز	سلیقے والا، تمیز والا	نری	صرف ، محض
کچی باتیں	بودی باتیں، بیکار باتیں	نکمّی	ناکارہ ، بیکار

نظم کا مقصد

نظم کا مقصد نظم کے آخری شعر میں اقبال نے خود بتادیا ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں ہے ۔ دنیا قدرت کا کارخانہ ہے ، قدرت کے کارخانے میں کوئی چیز بُری کیسے ہوسکتی ہے ؟ خدا کا ہر کام حکمت سے ہوتا ہے اس لیے سمجھنا چاہیئے کہ اُس نے ہر چیز کو کسی نہ کسی مقصد سے پیدا کیا ہے ۔

نظم کو پڑھ کر یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جس طرح گلہری نے پہاڑ سے بات کی یہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے آپ کو اور دنیا کو پہچانتے ہیں ۔ اس لیے اپنے آپ کو اور دنیا کو پہچاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے ۔ تاکہ آدمی کو اپنی اور اس دنیا کی قدر و منزلت معلوم ہو ۔ ورنہ جو لوگ اپنے آپ کو نہیں پہچانتے وہ ہر شاندار چیز کے آگے سر جُھکا دیتے ہیں اور اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو ہیچ سمجھ لیتے ہیں ۔

مشق

۱۔ کیا کوئی چیز دنیا میں بیکار ہے ؟ نہیں ہے تو اس کا کیا سبب ہے ؟

۲۔ گلہری اور پہاڑ کی گفت گو اپنے لفظوں میں لکھو ۔

۳۔ خالی جگہوں کو پر کرو :۔

(۱) کوئی پہاڑ . . . . . یہ کہتا تھا ۔ (۲) میری آن بان کے آگے . . . . پست ہے (۳) تو بھی تو آخر میری طرح . . . . نہیں ہے ۔ (۴) تجھ میں نری بڑائی ہے اور کیا . . . . . ہے

۴۔ اس نظم سے تم نے کیا سبق سیکھا ؟

. . . . . .

۵۔ سلطان مُراد اور معمار

ملک خجند[1] میں ایک معمار تھا جو فنِ تعمیر میں بڑا مشہور تھا۔ اس معمار نے سلطان مُراد کے حکم سے ایک مسجد بنائی۔ مگر بادشاہ کو اس کا کام پسند نہ آیا۔ اور اس کے اس قصور پر کہ مسجد اس کی خواہش کے مطابق نہ بنا سکا، بادشاہ ایسا غضبناک ہوا کہ اُس بیچارے کا ہاتھ کٹوا دیا۔ معمار اسی حالت میں قاضی کے پاس گیا اور اس کو بادشاہ کے ظلم کی داستان سنائی اور فریاد کی کہ محمد مصطفےٰ کے آئین کی حفاظت کرنا آپ کا کام ہے۔ میں بادشاہ کا غلام نہیں ہوں (اگر غلط کہتا ہوں تو) میرے دعوے کو قرآن سے غلط ثابت کیجیے۔"

قاضی کو بڑا افسوس ہوا۔ بادشاہ کے حاضر ہونے کا حکم جاری کر دیا۔ بادشاہ کے پاس قاضی کا حکم پہنچا تو قرآن کے ڈر سے اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ اور مجرموں کی طرح حاضر ہو گیا۔ وہ شرم سے سر جھکائے ہوئے تھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

اب ایک طرف وہ معمار تھا اور دوسری طرف بادشاہ۔ بادشاہ نے کہا "میں اپنے کیے پر نادم ہوں اور اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں"، قاضی نے کہا "خدا کا حکم ہے کہ قصاص (بدلے) میں زندگی ہے۔ اگر ظالم سے بدلہ نہ لیا جائے تو کسی کی زندگی محفوظ نہیں رہ سکتی۔"

۱۔ ترکستان میں ایک شہر ہے جس کو روس نے ۱۸۶۶ء میں فتح کیا تھا۔ اس وقت اس میں تاجیک قبیلے کے ترک آباد ہیں۔ خوقند سے ۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں علم و فن کا مرکز تھا۔

جب مُراد نے قرآن کی یہ آیت سُنی تو اپنا ہاتھ آستین سے باہر نکال دیا۔ یہ دیکھ کر معمار چپ نہ رہ سکا اُس نے قرآن کی آیت پڑھی۔ اِنَّ اللہ یَاْمُرُکُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ۔ (اللہ تم کو عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے) اور کہا میں نے بادشاہ کو خدا اور رسولؐ کے لیے معاف کیا۔

اقبال فرماتے ہیں کہ دیکھا! یہ ہے پیغمبر کے آئین کا دبدبہ کہ چیونٹی کو سلیمان پر فتح حاصل ہوگئی یعنی معمار بادشاہ کے مقابلے میں کامیاب ہوگیا۔ قرآن کے آگے غلام اور آقا برابر ہیں اور فقیر کے بوریے اور بادشاہ کے تخت میں کوئی فرق نہیں۔

مشق

۱۔ سلطان مُراد نے معمار کا ہاتھ کیوں کٹوایا؟

۲۔ ہاتھ کٹنے کے بعد معمار نے کیا کیا؟

نیچے لکھے ہوئے اُدھورے جملوں کو پورا کرو۔

(الف) مُلک خجند میں ایک . . . .

(ب) معمار کے ہاتھ سے خون . . . .

(ج) میرے اس دعوے کو قرآن سے . . . .

۴۔ بادشاہ نے جب اپنے جُرم کا اقرار کر لیا تو قاضی نے کیا کہا؟

۵۔ جب بادشاہ نے اپنا ہاتھ آستین سے باہر کر دیا تاکہ بدلے میں اس کا ہاتھ کاٹا جائے تو معمار نے کیا کہا؟

اقبال نے اپنی کتاب "رموزِ بیخودی" میں کئی حکایتیں اس غرض سے لکھی ہیں کہ اسلام نے جو آزادی، مساوات اور بھائی چارے کی تعلیم دی ہے، اس کو تاریخی واقعات سے ثابت کیا جائے۔ یہ حکایت انہی حکایتوں میں سے ایک ہے۔

"رموزِ بیخودی" فارسی زبان میں ہے ہم نے حکایت کا اُردو میں ترجمہ کر لیا ہے۔

۶۔ ہمدردی

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا
بُلبل تھا کوئی اُداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی
اڑنے چگنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک
ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سُن کر بلبل کی آہ و زاری
جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے
کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل
چمکا کے مجھے دیا بنایا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

(الفاظ کے معنی)

لفظ	معنی	لفظ	معنی
ٹہنی	شاخ	آشیاں	گھونسلا، گھر
اُداس	رنجیدہ	آہ و زاری	رونا چیخنا۔

نظم کا مقصد:۔ آخری شعر میں خود اقبال نے بتا دیا ہے۔ کہ دنیا میں اچھے لوگ وہ ہیں جو دوسروں کے کام آتے ہیں۔ اس نظم سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ یہ خیال غلط ہے کہ میں تو معمولی آدمی ہوں۔ کسی کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ بلکہ اپنی حیثیت کے مطابق جو مدد بھی آپ کر سکتے ہیں اُس سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔

مشق

۱۔ ان لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔

اُداس ۔ آہ وزاری ۔ شجر ۔ دیا ۔

۲۔ نیچے لکھے ہوئے شعر کو زبانی یاد کر لو۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

۳۔ اس شعر کو اپنی کاپی میں صاف صاف خوشخط نقل کرو۔

۷۔ پرندے کی فریاد

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا، اپنی خوشی سے جانا

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا

وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش! میرے بس میں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں، میں قید میں پڑا ہوں

آئی بہار، کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں؟
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

جب سے چمن چھٹا ہے، یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے، غم دل کو کھا رہا ہے

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

الفاظ کے معنی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
شبنم کے آنسو	اوس کے قطرے	بس	طاقت، قابو، اختیار
کامنی	خوبصورت، نرم و نازک	کلیاں ہنس رہی ہیں	کلیاں کھل رہی ہیں
صدائیں	آوازیں	دکھڑا	دکھ
اے کاش	کیا اچھا ہوتا		

نظم کا مقصد

اقبال کہتے ہیں ہر جاندار کو اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ اُس کی، فطرت کے عین مطابق ہے۔

آزادی بڑی نعمت ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے آزادی کا ایک دن غلامی کے سو سال سے بہتر ہے

وطن کی قدر اُس وقت ہوتی ہے، جب وطن چھوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح آزادی کی قدر اُس وقت ہوتی ہے جب کوئی قید میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ آرام کی قدر اس کو معلوم ہوتی ہے۔ جو مصیبت میں گرفتار ہوا ہو۔ لہٰذا پرندے کی فریاد سے سبق لیتے ہوئے ہمیں وطن، آزادی اور خدا کے بخشے ہوئے آرام و آسائش کی قدر کرنی چاہیئے۔

مشق

۱۔ ہمیں پرندے کی فریاد سے کیا سبق ملتا ہے؟

۲۔ خالی جگہوں میں لفظ لکھ کر نیچے لکھے ہوئے مصرعوں کو پورا کرو۔

(ا) آتا ہے یاد مجھ کو . . . . . زمانہ

(ب) آباد جس کے دم سے . . . . . آشیانہ

(ج) دکھے ہوئے دلوں کی . . . . . صدا ہے

۳۔ نیچے دیئے ہوئے الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔

دُکھڑا۔ بس۔ شبنم۔ کلیاں۔

۸۔ حکایت شیر اور شہنشاہ

حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ جن کی وجہ سے برصغیر میں مسلمانوں کے وقار میں اضافہ ہوا۔ اور شریعت اسلامیہ کا احترام بڑھا اس کی تلوار نے بے دینی کا خاتمہ کیا اور نیکی کی شمع روشن کی اورنگ زیب ایک دن صبح سویرے جنگل کی سیر کو نکلے۔ صرف ایک وفادار نوکر ساتھ تھا۔ نماز کا وقت ہوا تو نماز میں محو ہو گئے۔ اتنے میں ایک شیر نمودار ہوا جس کی آواز سے زمین لرزتی تھی وہ انسان کی بو پا کر شہنشاہ کی طرف جھپٹا اور حملہ کرنے ہی کو تھا کہ شہنشاہ نے نماز کی حالت میں ادھر ادھر دیکھے بغیر تلوار نکالی اور اس زور سے شیر پر ماری کہ اس کا پیٹ چاک ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کا شیر، قالین کا شیر بن گیا۔ اور شہنشاہ نماز میں پھر محو ہو گئے اُن کی نماز حضورِ دل سے ہونے کی وجہ سے مومن کی معراج تھی۔

اقبال فرماتے ہیں کہ مومن کے سینے میں ایسا ہی دل ہوتا ہے کہ اپنے مولا کے آگے ہیچ اور باطل کے مقابلے میں سب کچھ۔ اللہ کا خوف ایمان کی نشانی ہے اور اللہ کے سوا کسی اور کا خوف شرک کی دلیل ہے۔

۱۔ یہ حکایت ہم نے اقبال کی کتاب "رموزِ بیخودی" سے لی ہے اور اس کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کر لیا ہے۔ اس حکایت کے ذریعے اقبال نے یہ بتایا ہے کہ جس دل میں ایمان ہو، اس میں خدا کے سوا اور کسی کا خوف نہیں ہوتا۔

اس حکایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ شہنشاہ ہوتے ہوئے نماز کے کیسے پابند تھے اور پھر ان کی نماز بھی وہ نماز ہوتی تھی جس کو مسلمان کی معراج کہا

گیا ہے۔

مشق

۲۔ شہنشاہ عالمگیرؒ شیر سے بالکل نہیں ڈرے۔ اس کا کیا سبب ہے؟

۳۔ نیچے لکھے ہوئے ادھورے جملوں کو پورا کرو:۔

(الف) اورنگ زیب عالمگیر نے دین کی . . . . . .

(ب) شہنشاہ پھر نماز میں . . . . . .

(ج) اللہ کا خوف ایمان کی . . . . . .

الفاظ کے معنی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
برصغیر	پاکستان اور ہندوستان مل کر برصغیر کہلاتا ہے	محو ہوگیا	مگن ہوگیا، مصروف ہوگیا۔
احترام	عزت	حضورِ دل	دل کی حاضری، نماز پڑھتے وقت اِدھر اُدھر خیالات میں محو ہونے کی بجائے خدا کی طرف متوجہ رہے اسکو حضور دل کہتے ہیں
شریعت اسلامیہ	اسلامی قانون		
نمودار ہوا	ظاہر ہوا		
قالین کاشیر	قالین کی بناوٹ میں جو شیر بنا دیتے ہیں۔		
معراج	یہاں حضوری کی کیفیت مراد ہے۔		

۹۔ مرید ہندی اور پیر رومی

مولانا جلال الدین رومی رح فارسی کے بہت بڑے صوفی شاعر تھے۔ اُن کی مثنوی ایک مشہور کتاب ہے جس میں انہوں نے نیکی اور دین کی باتیں اس انداز سے بیان کی ہیں کہ جو سنتا ہے اثر قبول کرتا ہے۔ اقبال کو مولٰنا رومی رح سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ اپنے آپ کو رومی رح کا مُرید کہا کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے آپ کو مرید اور رومی کو پیر قرار دے کر انہوں نے عالم خیال میں مولانا سے کچھ نہایت مفید سوالات کیے ہیں۔ ہم اُن میں سے چند ایک سوالات اور ان کے جوابات یہاں نقل کر رہے ہیں۔ یہ سبق اقبال کی کتاب "بالِ جبریل" سے لیا گیا ہے۔

مرید ہندی

موجودہ تعلیم کی وجہ سے دین کی جو حالت ہے، دیکھنے والی آنکھ اُس پر خون کے آنسو روتی ہے۔

پیر رومی

جو کوئی علم سے تن کے پالنے، عیش کرنے اور نفس کی خواہش پورا کرنے کا کام لے گا اس کے حق میں علم سانپ بن جائے گا۔ اور جو علم سے اپنے نفس کی اصلاح کا کام لے گا اور اس کے ذریعے روح کی پاکیزگی اور دل کی صفائی حاصل کرے گا وہ اُس کے لیے ایک وفادار دوست ثابت ہوگا۔

یعنی علم بُری چیز نہیں ہے۔ ہم اپنے غلط استعمال سے اس کو بدنام کرتے ہیں۔ ہم کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں کمال پیدا کرنا چاہیے لیکن اُس کے ساتھ دین کا علم بھی حاصل کرنا چاہیے تاکہ علم حاضرہ کا صحیح استعمال کر سکیں۔

. . . . .

مرید ہندی

اے پیر! میں نے مشرقی و مغرب کے علوم حاصل کر لیے مگر روح کو چین نصیب نہ ہو سکا

پیر رومی

"وہ جو شخص ہر کس و ناکس کو حکیم سمجھ کر اپنی نبض اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے وہ بیمار ہی رہتا ہے۔ ایسی صورت میں چین اور اطمینان کیسے نصیب ہو سکتا ہے! تم کو ماں کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ تمہاری غمخواری اور تمہارا علاج وہی کرے گی، یعنی قرآن سے ہدایت حاصل کرو۔ تمام اخلاقی بیماریوں کا علاج اس میں موجود ہے۔

ہر شخص کو اپنا رہنما بنا لینا، ہر شخص کی باتوں پر عمل کر گزرنا ایسے ہی نتیجے پیدا کرتا ہے جیسے تم دیکھ رہے ہو۔

مرید ہندی

آہ! مدرسے کے نوجوان پر مغربی خیالات کے جادو نے کیا اثر کیا ہے کہ وہ بے بس ہو کر رہ گیا ہے!

پیر رومی

"ایسا ہونا لازمی بات ہے۔ کیونکہ وہ پرندہ جس کے ابھی پر نہیں اُگے ہیں، اڑنے کی کوشش کرے گا تو پہاڑ کھانے والی بلّی اس کو اپنا لقمہ بنانے کی کوشش کرے گی۔ پہلے اپنے بچوں کو دین کی تعلیم دے کر اُن کے دل پر دین کا رنگ جماؤ۔ اُس کے بعد اگر وہ انگریزی پڑھیں گے، سائنس اور ٹیکنالوجی میں کمال پیدا کرنا چاہیں گے تو وہ جدید علوم سے صحیح معنوں میں فائدہ اٹھانے کے قابل ہو سکیں گے۔

مرید ہندی

اے پیر! آپ کی باتوں سے مشرق زندہ ہے۔ یہ تو فرمایئے قومیں کس مرض سے ہلاک ہوئی ہیں؟

پیر رومی

پچھلی قوموں کے ہلاک ہونے کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے جدل کو عود سمجھ لیا،

بدی کو نیکی بدخواہ کو خیرخواہ قرار دے لیا۔ یعنی قومیں اچھے بُرے کی تمیز سے محروم ہوجانے کی وجہ سے ہلاک ہوتی ہیں ۔

الفاظ کے معنی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
مثنوی	ایک قسم کی نظم	ماں	یہاں اس سے قرآن مراد ہے کیونکہ قرآن کا ایک نام اُمّ الکتاب کتابوں کی ماں بھی ہے
عقیدت	محبت		
اِصلاح	درستی		
مشرق و مغرب	ایشیا اور یورپ		
جندلؔ	ایک قسم کا پتھر	ہلاک ہونا	مرنا
عُود	ایک خوشبودار لکڑی		

مشق

۱۔ مولانا رومی کون تھے؟ دو ایک جملوں میں ان کی تعریف کرو ۔

۲۔ رومی نے قوموں کی ہلاکت کا کیا سبب بتایا ہے؟

۳۔ مُرید ہند کون ہے؟ دو ایک جملوں میں ان کی تعریف کرو۔

۴۔ نیچے لکھے ہوئے الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کرو

عقیدت ۔ اصلاح ۔ ہلاک کرنا ۔

۵۔ نیچے کے جملوں میں خالی جگہ کو پُر کرو ۔

(الف) مولانا رومیؒ فارسی زبان کے بہت بڑے . . . . . ہوئے ہیں ۔

(ب) اقبال کو مولانا رومی سے بڑی . . . . . تھی ۔

(ج) جو کوئی علم سے اپنے نفس کی اصلاح کرے گا اس کے لیے علم . . . . . ہوگا

۱۰۔ چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے — تارے کہنے لگے قمر سے
نظّارے وہی رہے فلک پر — ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا — چلنا چلنا ، مدام چلنا
بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے — کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کش سفر سب — تارے ، انسان ، شجر ، حجر ، سب

ہو گا کبھی ختم یہ سفر کیا؟
منزل کبھی آئے گی نظر کیا؟

کہنے لگا چاند ، ہم نشینو! — اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو؟
جنبش میں ہے زندگی جہاں کی — یہ رسمِ قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ — کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس راہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں — جو ٹھہرے ذرا ، کچل گئے ہیں

انجام ہے اس خرام کا حُسن
آغاز ہے عشق ، انتہا حُسن

الفاظ کے معنی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
دَمِ سحر	صُبح کا وقت	خوشہ چین	بالیاں چننے والا۔ فائدہ اٹھانے والا

لفظ	معنی	لفظ	معنی
قمر	چاند	طلب	تمنا، خواہش
نظارے	تماشے	تازیانہ	کوڑا۔ طلب اور تمنا ہی سے دنیا ترقی کرتی ہے۔
حَجَر	پتھر		
ہم نشیں	ساتھی	مقام	جگہ
مَزرعِ شب	رات کی کھیتی	بے محل	بے موقع، نامناسب
		اجل	موت

نظم کا مقصد

اقبال کہتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز حرکت میں ہے۔ شجر و حجر، چرند، پرند، تارے انسان اور حیوان غرض زندگی اور اُس سے متعلق ہر شے مسلسل حرکت میں ہے۔ جو چلتے ہیں وہی منزل پاتے ہیں۔ اور جو حرکت اور کوشش ترک کر کے آرام سے بیٹھ رہتے ہیں۔ وہ ترقی سے محروم رہتے ہیں۔ اور ایسے لوگ زندہ نہیں کہلاتے۔ اسی طرح قوموں کا حال ہے۔ جو قومیں محنت و مشقت اور کوشش کرتی ہیں ترقی کی دوڑ میں وہی آگے رہتی ہیں اور ایسی ہی قومیں زندہ قومیں کہلاتی ہیں۔

علّامہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ حرکت اور کوشش کے لیے دل میں طلب کا ہونا ضروری ہے۔ اگر دل میں طلب اور آرزو باقی نہیں رہی تو ایسے دل کو مُردہ کہتے ہیں۔ اور مُردہ دل کوئی کام نہیں کر سکتا۔

مشق

۱۔ "زمانے کا گھوڑا تازیانہ کھا کر دوڑتا ہے" اس کا کیا مطلب ہے؟

۲۔ ایک شخص اور ایک قوم کی ترقی کس بات پر موقوف ہے؟

۳ ۔ اس نظم کو اپنی عبارت میں لکھو۔

۴ ۔ خالی جگہ میں الفاظ لکھ کر نیچے لکھے ہوئے مصرعوں کو پورا کرو۔

(الف) کام اپنا ہے . . . . . چلنا ۔

(ب) ہوگا کبھی ختم . . . . . کیا ؟

(ج) کھا کھا کے . . . . . تازیانہ ۔

۱۱۔ ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

الفاظ کے معنی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
غربت	پردیس	بیر	دشمنی
پربت	پہاڑ	محرم	رازداں، بھید
رشکِ جناں	جنت سے بہتر جس پر جنت کو بھی رشک آئے	دردِ پنہاں	پوشیدہ تکلیف، درد
		کارواں	قافلہ

۱۔ یہ ترانہ اقبال نے ۱۹۰۴ء میں لکھا تھا۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب وہ ایک مخلص

وطن دوست تھے ۔ اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی ۔ لیکن بعد میں انہوں نے "ترانہ ہندی" کے مقابلے میں "ترانہ ملی" لکھا ۔ کیوں کہ ان کو معلوم ہوگیا کہ ہندو سے بڑا کوئی فرقہ پرست نہیں اور اس کے ساتھ کسی طرح کا اتحاد ناممکن ہے ۔

مشق

۲۔ اقبال نے ترانۂ ہندی کب اور کیوں لکھا تھا ؟

۳۔ نیچے لکھے ہوئے الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کرو ۔

غربت ۔ رشکِ جناں ۔ بیر ۔ محرم ۔ درد نہاں

۴۔ نیچے لکھے ہوئے جملوں کو پورا کرو ۔

(الف) ۔ ہمارا ہندوستاں سارے جہاں سے . . . . . .

(ب) ۔ جب تیرے کنارے ہمارا کارواں . . . . . .

(ج) مذہب . . . . . آپس میں بیر رکھنا ۔

۱۲۔ ایک تاریخی واقعہ

ایک دن رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ تم میں جو، مال دار ہوں وہ اپنے مال میں سے کچھ خدا کی راہ میں بھی دیں یہ ارشاد سُن کر حضرت عمرؓ اُٹھے اور نہایت خوش خوش گھر گئے۔ کیونکہ اُس دن اُنکے پاس کئی ہزار درم تھے، آپ دل میں کہہ رہے تھے آج وہ ضرور حضرت صدیقؓ سے بازی لے جائیں گے۔ چنانچہ اپنا مال حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضورؐ نے فرمایا، عمرؓ! اہل وعیال کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟ مسلمان پر اپنے اہل وعیال کا بھی حق ہے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کی "حضورؐ! آدھا مال اہل وعیال کے لیے چھوڑ آیا ہوں اور آدھا قوم کے لیے ساتھ لایا ہوں"۔

اسی اثنا میں حضورؐ کے وہ رفیق بھی آگئے جن کی وجہ سے عشق ومحبت کی بنیادیں استوار ہیں۔ یعنی اُس کی وارفتگی اور شیفتگی کا یہ حال ہے کہ گھر سے جھاڑ پونچھ کر سب کچھ اُٹھا لائے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ بیوی بچوں کی فکر بھی ضروری ہے۔ حضرت صدیقؓ نے جواب میں عرض کیا۔ آپؐ کی ذات پاک کے دم سے یہ دنیا قائم ہے۔ جب ہر شے کا انحصار آپؐ پر ہے تو ابوبکرؓ کے لیے بس اللہ اور اس کا رسُول ہی کافی ہیں۔

صدیقؓ

اک دن رسول پاکؐ نے اصحاب سے کہا — دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مال دار
ارشاد سُن کے فرطِ طرب سے عمرؓ اُٹھے — ہیں روز ان کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور — بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار
لائے غرض کہ مال رسُولِ امیں کے پاس — ایثار کی ہے دست نگر ابتدائے کار

پوچھا حضورِ سرورِ عالمؐ نے اے عمرؓ! — اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تُو نے کیا؟ — مُسلّم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار
کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملّتِ بیضا پہ ہے نثار

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا — جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت — ہر چیز جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار
بولے حضورؐ چاہیے فکرِ عیال بھی — کہنے لگا وہ عشق و محبت کا راز دار
پروانے کو چراغ ہے بُلبُل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسُول بس!

الفاظ کے معنی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
اصحاب	صاحب کی جمع ہے ساتھی دوست، حضورؐ کو دیکھنے والے مسلمان، اصحاب اور صحابہؓ کہلاتے ہیں.	اہل وعیال	بیوی بچے
		حقوق	حق کی جمع ہے.

۱۔ یہ تاریخی واقعہ اقبال کی کتاب بانگِ درا سے لیا گیا ہے۔ نظم کا عنوان ہے صدیقؓ۔ اقبال اس تاریخی واقعے کو نظم کے ذریعے پیش کرنے سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضورؐ کے صحابہؓ آپ کے سچے عاشق تھے وہ راہِ خدا میں اپنا گھر بار لٹانے کے بعد بھی خوش رہتے تھے۔ اس لیے کہ ان کے اس فعل کو حضورؐ پسند فرمائیں گے نظم میں یہ بھی دکھایا ہے کہ وہ نیک کام میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کیسی کوشش کرتے تھے۔! یہی ہر شخص چاہتا تھا کہ کارِ خیر میں وہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے آگے ہی رہے۔

مشق

۱۔ حضرت عمر رضؓ نے حضورؐ اکرم کا ارشاد گرامی سننے کے بعد کیا کیا؟

۲۔ کیا حضرت عمر رضؓ اپنے دوسرے تمام ساتھیوں پر سبقت لے گئے؟ نہیں تو اس کا کیا سبب ہے؟

۳۔ نیچے لکھے ہوئے جملوں میں خالی جگہوں کو پُر کرو۔

(الف) اس دن حضرت عمر رضؓ کے پاس ..... تھے۔

(ب) حضورؐ نے فرمایا عمر رضؓ! ..... کیا چھوڑا ہے۔

(ج) صدیق رضؓ کے لیے خدا کا رسُول ..... ہے۔

۴۔ اس شعر کو زبانی یاد کر لو۔ اور اپنی کاپی میں صاف صاف لکھ لو۔

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق رضؓ کے لیے ہے خدا کا رسُول بس

۱۳۔ غنی کاشمیری

اقبال نے "غنی کاشمیری کا ایک واقعہ اپنی کتاب "پیامِ مشرق" میں نظم کیا ہے۔ اقبال کو یہ واقعہ اس لیے پسند آیا کہ "اس سے اپنے آپ کو پہچاننے کا سبق ملتا ہے۔

کشمیر کا مایۂ ناز شاعر غنی جب اپنے گھر میں ہوتا تھا تو گھر کا دروازہ بند رکھتا تھا اور جب گھر سے باہر جاتا تھا تو گھر کو چوپٹ چھوڑ جاتا تھا۔ کسی نے اس سے کہا غنی! آپ کا یہ کام ہر شخص کو عجیب معلوم ہوتا ہے۔ جواب دیا اور اس فقیر صفت شاعر نے کیا خوب جواب دیا کہ "دوستوں نے جو کچھ دیکھا وہ بالکل صحیح ہے۔ مگر اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ جب تک غنی گھر میں ہوتا ہے۔ یہی گھر کی سب سے قیمتی متاع ہے اس لیے اس کی حفاظت کے لیے گھر کا دروازہ بند رکھنا ضروری ہے مگر جب وہ گھر میں نہیں ہوتا تو پھر اس گھر میں کیا رہ جاتا ہے جس کی حفاظت کی جائے

(الفاظ کے معنی)

لفظ	معنی	لفظ	معنی
مایۂ ناز	بہت زیادہ قدر کے قابل	متاع	پونجی، قیمتی چیز
فقیر صفت	درویشوں کی سی عادت رکھنے والا	چوپٹ	چاروں طرف کھلا ہوا

مشق

۱۔ غنی کاشمیری کا واقعہ اپنے الفاظ میں بیان کرو۔

۲۔ اقبال نے اس واقعے کو اس قدر کیوں پسند کیا؟

۳۔ لوگوں کی دریافت کرنے پر غنی نے اپنی اس عادت کے بارے میں کیا جواب دیا؟

۴۔ ذیل کے ادھورے جملوں کو پورا کرو۔

(الف) غنی کشمیر کا ..... تھا۔

(ب) وہ فارسی زبان کا مایۂ ناز ..... تھا

(ج) جب وہ اپنے گھر سے باہر جاتا تھا تو گھر کو ..... چھوڑ جاتا تھا۔

۵۔ مندرجہ ذیل لفظوں کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔
فقیر صفت ۔ چوپٹ ۔ قیمتی متاع ۔

۱۴۔ ایک گائے اور بکری

اک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں
تھی سراپا بہار جس کی زمیں

کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں
ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں

تھے اناروں کے بے شمار درخت
اور پیپل کے سایہ دار درخت

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں
طائروں کی صدائیں آتی تھیں

کسی ندی کے پاس اک بکری
چرتے چرتے کہیں سے آنکلی

جب ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا
پاس اک گائے کو کھڑے پایا

پہلے جھک کر اُسے سلام کیا
پھر سلیقہ سے یوں کلام کیا

"کیوں بڑی بی مزاج کیسے ہیں؟
گائے بولی کہ "خیر، اچھے ہیں

کٹ رہی ہے بُری بھلی اپنی
ہے مصیبت میں زندگی اپنی

جان پر آ بنی ہے، کیا کہیئے؟
اپنی قسمت بُری ہے، کیا کہیئے

دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں
رو رہی ہوں بُروں کی جان کو میں

زور چلتا نہیں غریبوں کا۔
پیش آیا لکھا نصیبوں کا۔

آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے
اس سے پالا پڑے، خدا نہ کرے

دودھ کم دوں تو بڑبڑاتا ہے
ہوں جو دُبلی، تو بیچ کھاتا ہے

ہتھکنڈوں سے غلام کرتا ہے
کن فریبوں سے رام کرتا ہے!

اس کے بچوں کو پالتی ہوں میں
دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں

بدلے نیکی کے یہ برائی ہے!
میرے اللہ! تری دہائی ہے"

سُن کے بکری یہ ماجرا سارا۔ بولی ، ایسا گلا نہیں اچھا
بات سچی ہے بے مزا لگتی ... میں کہوں گی ، مگر خدا لگتی
یہ چراگہ ، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا یہ ہری گھاس اور یہ سایا
ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں یہ کہاں ، بے زباں غریب کہاں؛
یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
اس کے دم سے ہے اپنی آبادی قید ہم کو بھلی ، کہ آزادی؟
سو طرح کا بنوں میں ہے کھٹکا واں کی گزران سے بچائے خدا
ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا ہم کو زیبا نہیں گلا اس کا
قدر آرام کی اگر سمجھو ... آدمی کا کبھی گلا نہ کرو ..
گائے سُن کر یہ بات شرمائی آدمی کے گلے سے پچھتائی
دل میں پرکھا بھلا بُرا اُس نے اور کچھ سوچ کر کہا اس نے
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

الفاظ کے معنی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
سراپا	سر سے پیر تک ، تمام پورے کا پورا ۔	خدا لگتی کہنا	حق بات کہنا
		بن	جنگل
سماں	کیفیت ۔ منظر	گزران	وقت گزارنا
طائر	پرندہ	زیبا نہیں	اچھا نہیں ، زیب نہیں دیتا
جان پر آبنی ہے	جان خطرے میں ہے		
پیش آیا	سامنے آیا ۔ دیکھنا پڑا	دل کو لگنا	دل کو بھانا ، دل کو پسند آنا ۔

لفظ	معنی	لفظ	معنی
تیری دُہائی ہے	تیری پناہ مانگتا ہوں	ماجرا	قصّہ
گِلا	شکوہ، شکایت		

نظم کا مقصد

انسان کو کسی کی شکایت خوب سوچ سمجھ کر کرنی چاہیئے تاکہ بعد میں شکایت کے بیجا ہونے پر شرمندہ نہ ہونا پڑے ۔

کسی شخص کی برائیوں کے ساتھ ساتھ اُس کی خوبیاں بھی نظر میں رکھنا چاہیئے ۔ یہ بڑی بے انصافی کی بات ہے کہ کسی کی خوبیوں کو چھوڑ کر اس کی بُرائیوں کو بیان کرنا شروع کر دیا جائے ۔ بلکہ اخلاق کی خوبی تو اس میں ہے کہ لوگوں کی بُرائیوں سے نگاہ بچا کر ان کی خُوبیوں ہی کی تعریف کی جائے ۔

عقل کا تعلق مرتبے یا جسمانی طور پر بڑے ہونے سے نہیں ہے کہ فلاں شخص بڑے مرتبے یا بڑے ڈیل ڈول کا ہے تو اس میں چھوٹے مرتبے اور چھوٹے قد و قامت والے کے مقابلے میں عقل زیادہ ہوگی ۔ بکری، گائے سے بہت چھوٹی ہوتی ہے مگر جس حقیقت پر اُس کی نظر پہنچی، گائے کی نظر وہاں تک نہ پہنچ سکی ۔

اچھے لوگوں کا یہ شیوہ ہوتا ہے کہ جب کوئی دوسرا آدمی اُن کی غلطی پر ٹوکتا ہے ۔ تو وہ اس سے لڑنے جھگڑنے کے بجائے اپنی غلطی کا اقرار کر لیتے ہیں ۔ جیسا کہ گائے پر اُسکی غلطی ظاہر ہوگئی تو اُس نے اُسے فوراً مان لیا ۔ بلکہ بکری کی سمجھ بوجھ اور دانائی کی تعریف بھی کی ۔ حالانکہ قد و قامت میں وہ بکری سے کئی گنا بڑی ہے ۔

مشق

۱ ۔ گائے نے آدمی کی کیا شکایت اور بکری نے کیا تعریف کی ہے ۔ چند جملوں میں بیان

کرو۔

۲۔ پوری نظم پڑھنے کے بعد تم اس سے کیا کیا سبق حاصل کرتے ہو ؟

۳۔ نیچے لکھے ہوئے جملوں میں خالی جگہیں پُر کرو :۔

(الف) اناروں کے . . . . . درخت تھے ۔

(ب) طائروں کی . . . . . آرہی تھیں

(ج) ہتھکنڈوں سے . . . . . کرتا ہے

۴۔ اس شعر کو زبانی یاد کرو۔

بدلے نیکی کے یہ بُرائی ہے　　میرے اللہ تری دُہائی ہے !

۵۔ اس شعر کو صاف صاف خوشخط اپنی کاپی میں نقل کرو۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں　　طائروں کی صدائیں لاتی ہیں

۱۵۔ قیامِ پاکستان

برصغیر پاک و ہند پر تقریباً ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل شاہزادوں کی خانہ جنگی اور باہمی مخالفت کی وجہ سے سلطنت کمزور ہوتی گئی اور انگریزوں کا اقتدار جو اس ملک میں تجارت کی غرض سے آئے تھے بڑھتا چلا گیا اور وہ رفتہ رفتہ بہت سے علاقوں پہ قابض ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مُغل سلطنت کا چراغ، جو مدت سے ٹمٹما رہا تھا، ہمیشہ کے لیے گُل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی انگریز پوری طرح ملک پر مسلّط ہو گئے۔

چونکہ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لیے وہ قدرتی طور پر مسلمانوں سے بدگمان رہتے تھے کہ اگر انہیں کبھی موقع مِل گیا تو وہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت واپس لینے کی کوشش کریں گے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی نے اس بدگمانی کو اور مستحکم کر دیا۔ انگریزوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ تحریک مسلمانوں کی اسی طرح کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اُنہوں نے مسلمانوں کی قوت کو پامال کرنا شروع کر دیا جہاں کہیں کسی اُونچے گھرانے کو دیکھ پاتے، اسے تباہ کر کے مفلسی اور بے کسی کی حالت تک پہنچا دیتے۔ اس کے برعکس ہندوؤں کی پُشت پناہی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مسلمان روز بروز پستی کی طرف گرتے چلے گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں زندگی کے ہر شُعبے میں اپنے ہم وطنوں سے بہت پیچھے رہ گئے۔

یہ حالت دیکھ کر بعض دردِ دل رکھنے والے مسلمانوں نے قوم کو تباہی سے بچانے کا بیڑا اُٹھایا۔ سرسیّد کا نام ان رہنماؤں میں سرِفہرست ہے۔ اُنہوں نے قوم کو بیدار کرنے اور ترقی کی راہ پر چلانے کے لیے جدوجہد شروع کی۔ بالآخر قوم نے جھرجھری لی

آنکھیں کھولیں ۔ اپنی زبوں حالی کی طرف نگاہ ڈالی اور خدا کا نام لے کر اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی ۔

قوم کی اس کروٹ کو جہاں ہندوؤں نے شُبہ کی نگاہ سے دیکھا وہاں انگریزوں نے اپنے لیے خطرے کا پیش خیمہ سمجھا ۔ دونوں نے مل کر مسلمانوں کی تحریک بیداری کو دبانے کی کوشش کی لیکن مخلص رہنماؤں کی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کی بدولت یہ تحریک زندہ رہی اور مسلمان برابر اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہے ۔

مسلمانوں کی دلی خواہش یہ تھی کہ سب سے پہلے اپنے ملک کو انگریزوں کے تسلّط سے آزاد کرایا جائے اس مقصد کے لیے اُنہوں نے برادرانِ وطن کی طرف مکمل تعاون کا ہاتھ بڑھایا ۔ لیکن ہندوؤں نے اس تعاون کو کبھی بھی سچّے دل سے قبول نہ کیا ۔ بلکہ ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ مسلمانوں کے مفاد کو نظر انداز کیا جائے اور صرف اپنے فائدے پر نظر رکھی جائے چنانچہ مسلمان رہنماؤں کو جب یقین ہو گیا کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی ترقی کسی طرح گوارہ نہیں اور وہ اکثریت کے گھمنڈ میں مسلمانوں کو رعایتیں دینا تو درکنار اُن کے واجبی حقوق تک دینے کو تیار نہیں تو انہوں نے اپنے لیے ایک الگ حکومت کا نقشہ ذہن میں بنانا شروع کیا ۔

اس آزاد اسلامی حکومت کا واضح تصوّر سب سے پہلے حضرت علاّمہ کے دل میں پیدا ہوا ۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کا ایک اجلاس الٰہ آباد میں منعقد ہوا ۔ علاّمہ اقبال اس اجلاس کے صدر تھے ۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا کہ میری نگاہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی باہمی کش مکش کا واحد حل یہ ہے کہ ہندوستان کے جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں، انہیں ملا کر انگریزی حکومت کے زیرِ اثر یا اس سے آزاد ایک سلطنت قائم کر دی جائے ۔ تاکہ وہاں مسلمان اپنے مذہب، تمدن، اور روایات کے مطابق آزادی سے زندگی بسر کر سکیں ۔

اس نصب العین کو مدِنظر رکھ کر حضرت قائدِاعظم محمّد علی جناحؒ نے مسلم لیگ کی از سرِ نو تنظیم کی ۔ شروع شروع میں ہندوؤں کے علاوہ انگریزی حکومت نے

بھی مسلمانوں کی اس تنظیم کی سخت مخالفت کی اور اُن کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالیں۔ لیکن قائداعظمؒ کی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ گئی۔ مسلمان قائداعظمؒ کی رہنمائی میں یک زباں ہو کر اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگے۔ آخر کار ۱۹۴۰ء میں باقاعدہ قرارداد کی شکل میں آزاد اسلامی مملکت کا مطالبہ پیش کر دیا۔ یہ قرارداد ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے اجلاس میں متفقہ طور پر منظور ہوئی جس کی یاد میں ہم ہر سال اس تاریخ کو یوم پاکستان مناتے ہیں۔ بلکہ قرارداد کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے لاہور میں ایک عظیم الشان مینار تعمیر کیا گیا ہے جسے مینارِ پاکستان کہتے ہیں۔ یہ مینار اُس مقام پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس ہوا تھا۔

اس قرارداد کے بعد حصولِ پاکستان کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ سات سال تک مسلمانوں نے برابر جدوجہد جاری رکھی۔ ہر طرح کی مصیبتیں جھیلیں، جانیں قربان کیں، قید و بند کی سختیاں برداشت کیں لیکن اپنے مقصد سے ایک انچ بھی نہ ہٹے۔ آزادی کے اس دور کی کہانی جتنی درد بھری ہے اسی قدر ولولہ انگیز بھی ہے مسلمانوں نے قائداعظم کے حکم سے ذرا سرتابی نہیں کی۔ ہر مصیبت خاموشی سے برداشت کی اور ثابت قدمی سے ڈٹے رہے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ایثار، قربانی، جانبازی اور حق پرستی کو قبول فرمایا۔ ہندو اور انگریز مسلمانوں کے بے پناہ جذبے کو نہ دبا سکے۔ انہوں نے اپنی تمام قوتیں آزما کے دیکھ لیں۔ ان کا کوئی حربہ کارگر نہ ہوا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ لوگ جس بات پر اڑ جائیں اسے پورا کر کے رہتے ہیں۔ اس لیے انگریز کو اپنی سلطنت کی قوت اور ہندو کو اپنی کثرت کے گھمنڈ کے باوجود مسلمانوں کے مطالبے کے آگے جھکنا پڑا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو آدھی رات کے وقت دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک ابھرا جس کا نام پاکستان ہے وہ ملک جس میں ہم آزادی کے ساتھ خدا کا نام لیتے ہیں اور عزت آبرو کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس پیارے ملک پاکستان کے

لیے ہمارے بزرگوں نے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ ہم بھی اس کی حفاظت کے لیے اور اس کی ترقی کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

"پاکستان پائندہ باد"[1]

الفاظ کے معنی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
خانہ جنگی	آپس کی لڑائی	تعاون	ساتھ دینا، مدد کرنا
اِقتدار	طاقت، حکومت	اکثریت	کسی چیز کا زیادہ ہونا۔
رفتہ رفتہ	آہستہ آہستہ	نصب العین	مقصد
مسلّط	قابض	مدِّنظر رکھنا	سامنے رکھنا
مستحکم	مضبوط	تنظیم	جماعت، پارٹی
تحریک	انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی۔	ایثار	قربانی، اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دینا۔
پامال	برباد		
برعکس	خلاف	جانبازی	جان کی بازی لگانا، سرفروشی۔
پشت پناہی	مدد، حمایت		
بیڑا اٹھانا	کسی مشکل کام کرنے کا عہد کیا۔	حربہ	لڑائی کا ہتھیار، حملہ
		خطوط	لکیریں، خط کی جمع ہے
دریغ نہ کیا	تامّل نہ کیا۔ کمی نہیں کی	بیدار کیا	جگایا
سرِفہرست	سب سے اونچا	زبوں حالی	خراب حالت
جھرجھری لی	حرکت میں آئی	تسلّط	قبضہ

[1] ۔ ماخوذ از "اردو کی پانچویں کتاب"۔

۱۔ برِصغیر پاک و ہند پر مسلمانوں نے کتنی مدت حکومت کی ؟
۲۔ مسلمانوں کی حکومت کیوں ختم ہوئی ؟
۳۔ انگریز مسلمانوں سے کیوں بدگمان تھے ؟
۴۔ کیا ہندوؤں نے مسلمانوں کے تعاون کی قدر کی ؟
۵ سب سے پہلے پاکستان کا تصوّر کس نے کب اور کہاں پیش کیا ؟ مختصر طور پر بیان کرو۔
۶۔ پاکستان کے بانی کون تھے ؟ دو ایک جملوں میں انکا تعارف کراؤ۔
۷۔ خالی جگہوں کو پُر کرو۔

(i) پاکستان . . . . . کو قائم ہوا۔
(ii) پاکستان کا تصوّر سب سے پہلے . . . . . نے پیش کیا تھا۔
(iii) پاکستان کے بانی . . . . . تھے۔

۱۶۔ حامد اور محمود کے درمیان

مکالمہ

حامد۔ محمود صاحب! اقبال کی نظموں میں سے کونسی نظم آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے؟

محمود۔ بھئی اقبال کا کلام جتنا اُردو میں ہے اُتنا ہی فارسی میں ہے۔ بلکہ فارسی میں اُردو کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہے۔ کہتے ہیں اُن کا فارسی کلام اپنے اندر بڑی گہرائی رکھتا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اپنے فلسفیانہ خیالات زیادہ تر فارسی میں بیان کیے ہیں اور میرا حال یہ ہے کہ فارسی میں بس شُدبُد رکھتا ہوں لہٰذا ان کے فارسی کلام کے بارے میں تو کچھ نہیں بتا سکتا۔

حامد۔ یہ بات آپ نے بالکل صحیح فرمائی ہے کہ اقبال کا زیادہ تر کلام فارسی میں ہے اور فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے اپنے اندر گہرائی بھی رکھتا ہے۔ تو پھر ان کے اُردو کلام میں سے اپنی پسند کی بہترین نظم کا نام بتائیے۔

محمود۔ اُردو کلام میں بھی بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز (حصّہ اُردو) آسان نہیں ہیں یہ کتابیں بھی اقبال کے ویسے ہی فلسفیانہ اور عارفانہ خیالات سے بھری پڑی ہیں۔ اس لیے اُن میں سے بھی کسی نظم کا انتخاب کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔

حامد۔ اچھا بھائی! تو پھر اُن کے آسان اُردو کلام میں سے سہی، میں تو نظم کے انتخاب سے آپ کے خیالات اور آپ کی طبیعت کا رجحان معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

محمود۔ بھئی! بانگِ درا جو اقبال کے ابتدائی اُردو کلام کا مجموعہ ہے، مجھے اس

میں سب سے زیادہ "شکوہ" اور "جواب شکوہ" پسند ہیں۔ بلکہ دیکھنے میں آیا ہے میری عمر اور قابلیت کے دوسرے لڑکوں کو بھی یہیں دو نظمیں زیادہ پسند ہیں۔ بہت سے نوجوان طالبعلموں کو تو یہ نظمیں زبانی یاد ہیں۔ پھر نوجوانوں پر ہی کیا موقوف بوڑھوں کو بھی ان نظموں کی تعریف کرتے سنا گیا ہے۔ بہت سے مقرر اور واعظ بھی اپنی تقریروں میں ان نظموں کے اشعار سے جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حامد۔ واللہ محمود! آپ نے تو میرے دل کی بات کہدی۔ اپنے اور آپ کے خیالات میں اس قدر یکسانیت دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔

محمود۔ میں نے کہا تھا نا! کہ میں کیا اکثر و بیشتر نوجوان طالب علم انہیں دو نظموں، کو زیادہ پسند کرتے ہیں چنانچہ آپ کی پسند سے میرے اس دعوے کی تصدیق بھی ہو گئی۔

حامد۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ آپ شکوہ اور جواب شکوہ کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں اب یہ بھی بتا دیجئے کہ ان نظموں کو آپ کس لیے بہت پسند کرتے ہیں؟۔

محمود۔ میں نے جب پہلی بار مولانا حالی مرحوم کی مسدّس پڑھی تو یقین کیجئے مجھ پر اُس کا اتنا اثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ بہت سے بند از بر ہو گئے۔ جن کو خود بھی پڑھتا اور دوسروں کو بھی سُناتا۔ حالی نے اپنی مسدّس، میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ جب میں نے شکوہ اور جواب شکوہ پڑھا تو فوراً خیال آیا کہ یہاں بھی مسلمانوں کے عروج و زوال ہی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مگر ایک نئے اور مختلف انداز میں علّامہ نے عروج و زوال کی داستان اگرچہ تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کی۔ مگر جو کچھ لکھا ہے وہ جوش، ولولے اور دل سوزی سے اس قدر بھرا ہوا ہے کہ دل میں تیر و نشتر کی طرح اُترتا چلا جاتا ہے۔ زوال کے اسباب جو شکوہ کے جواب میں بتائے گئے ہیں، وہ اس قدر صحیح ہیں کہ اُن سے انکار کی،

گنجائش کسی کو نہیں ہو سکتی۔ شکوہ کو پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر بڑے زور و شور کے ساتھ اپنی قومی تاریخ کے ورق الٹتا چلا جا رہا ہے کہ ہم نے یہ کیا، ہم نے وہ کیا۔ اور پھر بھی ہم ہی سب سے زیادہ مصیبتوں میں گرفتار اور ذلت خواری میں مبتلا ہیں! مگر جب خدا کی طرف سے اس کا جواب ملتا ہے کہ تم جو اس قدر بڑھ بڑھ کے بول رہے ہو ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم کیا ہو؟ وہ تو تمہارے اسلاف کے کارنامے ہیں۔ تم نے کیا کیا ہے؟ اپنے کارنامے پیش کرو۔ تو شاعر اپنا سا منہ لے کے رہ جاتا ہے۔

حامد۔ اقبال نے اپنے شکوے میں کیا دعوے کیے ہیں؟ ان میں سے خاص خاص دعوے تو بیان کیجیے۔

محمود۔ کہتے ہیں کہ ہم سے پہلے دنیا کا یہ حال تھا کہ کہیں پتھروں کی پوجا ہے تو کہیں درختوں کی، کہیں ستاروں کی، کہیں آگ کی اور کہیں کسی اور چیز کی۔ خدا کو کوئی نہیں مانتا تھا۔ ہم نے منوایا ہے، خدا کا نام اور اس کا کلمہ ہم نے بلند کیا ہے۔ اس کے لیے جنگیں تک لڑی ہیں، اپنی جانوں کی پروا کی نہ اپنے مال کی اور نہ اپنے عزیز و اقارب کی۔ پھر خشکی میں بھی لڑے اور دریاؤں میں بھی بلکہ بحرِ ظلمات میں بھی ہم نے گھوڑے دوڑا دیئے۔

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی اُن دیکھے خدا کو کیونکر
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جلداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کیلئے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کیلئے

تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے — سربکف پھرتے تھے، کیا دہر میں دولت کیلئے
قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بُت فروشی کے عوض بُت شکنی کیوں کرتی؟

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اَڑ جاتے تھے — پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اُکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی، تو بگڑ جاتے تھے — تیغ کیا چیز ہے، ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سُنایا ہم نے

تو ہی کہدے کہ اُکھاڑا درِ خیبر کس نے؟ — شہر قیصر کا جو تھا اُس کو کیا سَر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟ — کاٹ کر رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی؟ — اور تیرے لیے زحمت کشِ پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر، جہاندار ہوئی؟ — کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی؟
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے؟
مُنہ کے بل گر کے ھُوَ اللّٰہُ احد کہتے تھے!

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز — قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز!
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے — مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے — اور معلوم ہے تجھ کو، کبھی ناکام پھرے؟
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے　　نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے　　تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

خدا سے کہتے ہیں تیری دنیا کا عجیب حال تھا۔ کہیں پتھروں کی پُوجا تھی، کہیں درختوں کی اور کہیں کسی اور چیز کی۔ انسان محسوس چیز کو پوجنے کا خوگر تھا۔ بھلا وہ اَن دیکھے خدا کو کیوں کر مانتا۔

تُو جانتا ہے کہ تیرا کوئی نام بھی لیتا تھا؟ مسلمانوں کی قُوّتِ بازو نے تیرا کام کیا تیرے دین کی تبلیغ کی اور تجھے منوایا۔

اسی دنیا میں سلجوقی بھی تھے، تورانی بھی تھے، چینی بھی تھے، ساسانی بھی تھے، یونانی بھی تھے اور نصرانی بھی تھے مگر تیرے نام پر تلوار کس نے اُٹھائی؟ جو بات بگڑی ہوئی تھی وہ کس نے بنائی؟ (ہم نے تلوار اُٹھائی اور دین کی بگڑی ہوئی بات بنائی)

تیرے لیے جنگ کرنے والے تنہا ہم ہی تھے۔ ہم خشکیوں میں بھی لڑے اور دریاؤں میں بھی لڑے۔ کبھی ہم نے یورپ کے کلیساؤں اور کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اذانیں دیں۔ بادشاہوں کی شان ہماری آنکھوں میں نہیں جچتی تھی۔ ہم تلواروں کی چھاؤں میں بھی تیرا ہی کلمہ پڑھتے تھے ہم جیتے مصیبت سہنے کے لیے تھے اور مرتے تیرے نام کی عظمت کے لیے تھے (کہ اس نام کی عظمت میں فرق نہ آئے) ہماری جنگ حکومت کے لیے نہیں تھی۔ دنیا میں ہم دولت کے لیے سر ہتھیلی پر لیے نہیں پھرتے تھے۔ اگر ہم دنیا کے زر و مال پر مرتے تو بُت فروشی کے عوض بُت شکنی کیوں کرتے؟

ہم جنگ میں اَڑ جاتے تھے تو پھر ٹل نہیں سکتے تھے۔ ہمارے مقابلے میں شیروں

کے پاؤں بھی اُکھڑ جاتے تھے (بڑے سے بڑا بہادر بھی ہمارے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتا تھا)۔

اگر تجھ سے کوئی سرکشی کرتا تھا تو ہم بگڑ جاتے تھے۔ پھر تلوار تو تلوار توپ کا بھی مقابلہ کرنے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔ ہم نے توحید کا نقش ہر دل پر بٹھایا اور تلوار کے زیرِ سایہ بھی توحید کا پیغام سُنانے سے باز نہیں آئے تو ہی بتا درِ خیبر کس نے اُکھاڑا، قیصر کے شہر کو کس نے فتح کیا، جھوٹے خداؤں کے ہیکل کس نے توڑے اور کافروں کے لشکروں کے لشکر کس نے کاٹ کر رکھ دیئے، ایران کے آتش کدوں کو کس نے ٹھنڈا کیا، اور تیرے ذکر کو پھر سے کس نے زندہ کیا، (شاعر بتانا یہ چاہتا ہے) یہ سب کچھ ہمیں نے تو کیا تھا — ہمارے سوا اور کونسی قوم تیری چاہنے والی ہوئی تیرے لیے جنگ کی زحمت کس نے اُٹھائی صنم کس کی ہیبت سے ڈرے سہمے ہوئے رہتے تھے؟ ایسے سہمے ہوئے کہ منہ کے بل گر کے بھی اللہُ اَحَد ہی کہتے تھے۔

عین لڑائی کی حالت میں اگر نماز کا وقت آجاتا تھا تو ہم فوراً صف باندھ کر قبلہ رو ہو جاتے تھے اور نماز ادا کرتے تھے۔ اور اس شان سے ادا کرتے تھے کہ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے تھے آقا و غلام، نادار اور مالدار تیرے حضور میں آکر کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔

ہم کون و مکاں (دنیا) کی محفل میں صبح و شام پھرتے رہتے تھے اور توحید کی شراب لے کر جام کی طرح گردش میں رہتے تھے۔ خشکی تو خشکی ہم نے دریا بھی نہیں چھوڑے۔ یہاں تک کہ بحرِ ظلمات میں بھی گھوڑے دوڑا دیئے۔

دنیا سے باطل کو ہمیں نے مٹایا، نوعِ انساں کو غلامی سے ہمیں نے چھڑایا۔ تیرے کعبے کو اپنی پیشانیوں سے ہمیں نے بسایا۔ تیرے قرآن کو سینے سے ہمیں نے لگایا۔ پھر بھی ہم سے یہ شکایت ہے کہ ہم وفادار نہیں ہیں۔ اگر ہم وفادار نہیں ہیں تو تُو بھی تو دلدار نہیں ہے۔

غرض یوں لگتا ہے جیسے مسلمانوں کی پوری تاریخ اپنی ساری تابناکیوں کے ساتھ

ان چند صفحات میں سمٹ آئی ہے۔

چنانچہ آخر میں اقبال کہتے ہیں کہ اتنی ساری قربانیوں اور سرفروشیوں کے باوجود بھی تیری رحمتیں غیروں پر نازل ہو رہی ہیں اور ہم پر بجلیاں ہی گرائی جا رہی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

حامد۔ واقعی شکوہ تو اپنے اندر بڑی گھن گرج رکھتا ہے۔ اگرچہ دعوے غلط نہیں ہیں مگر خدا کے سامنے اس انداز سے گفتگو کرنا شاید قابل اعتراض بات ہو۔

محمود۔ مگر اقبال تو اس کے قائل ہی نہیں کہ انہوں نے شکوہ کر کے کوئی گستاخی کی ہے۔ کیونکہ وہ شکوے کے شروع میں یہ کہہ چکے ہیں کہ:

شکوہ اللہ سے حاکم بدہن ہے مجھ کو
پھر خدا کی طرف سے بھی اس کی اسی طرح تعریف کی گئی ہے:۔
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے
شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے

یعنی شکوہ اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ اس کو شکر بنا دیا ہے۔ اور بندوں کو خدا سے ہم کلام کر دیا ہے۔

حامد۔ یہ تو فرمائیے اقبال نے جو شکوے میں زور شور سے مسلمانوں کے کارنامے گنوائے ہیں اور ان کارناموں کے باوجود مسلمانوں کو جس ذلت و خواری سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اس کے بارے میں خدا کی طرف سے کیا جواب ملا؟

محمود۔ اس کے بارے میں کچھ نہ پوچھو! بڑا عبرت ناک جواب ملا ہے۔ آواز آئی

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے — نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے — میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک — ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختارؐ — مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے، شعارِ اغیار — ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا، تو غریب — زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا، تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا، تو غریب — پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا، تو غریب

اُمرائے نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملتِ بیضا غربا کے دم سے

ہر مسلماں رگِ باطل کے لیے نشتر تھا۔ — اس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسہ تھا اسے، قوتِ بازو پر تھا — ہے تمہیں موت کا ڈر، اُس کو خدا کا ڈر تھا

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیوں کر ہو!

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے — تم مسلمان ہو، یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدرؓ و فقر ہے، نے دولتِ عثمانیؓ ہے — تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم — تم خطا کار و خطا بیں، وہ خطا پوش و کریم

چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم
تختِ فغفور بھی انکا تھا سریر کے بھی
یونہی باتیں ہیں، کہ تم میں وہ حمیت، ہے بھی

خودکشی شیوا تمہارا، وہ غیور و خوددار تم اخوت سے گریزاں، وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت اِن کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت، ان کی

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں اُمّتی باعثِ رسوائیِ پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے، بت گر ہیں تھا براہیم پدر اور پسر آذر ہیں
بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خُم بھی نئے
حرمِ کعبہ نیا، بت بھی نئے، تم بھی نئے

کس قدر تم پہ گراں، صبح کی بیداری ہے ہم سے کب پیار ہے، ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے تم ہی کہدو یہی آئین وفاداری ہے؟
قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ، وہ خرمن تم ہو بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن، تم ہو
ہونکو نام جو قبروں کی تجارت کرکے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

محمود۔ جواب شکوہ، کے مندرجہ بالا بندوں کی مختصر تشریح کرتے ہوئے بات جاری رکھتے ہیں۔ یہ درست کہ جنھوں نے باطل کو دنیا سے مٹایا، نوع انساں کو کو غلامی سے چھڑایا، میرے کعبے کو اپنی پیشانیوں سے آباد کیا، میرے قرآن کو سینوں سے لگایا، وہ تھے تو تمہارے ہی باپ دادا مگر یہ بتاؤ کہ تم کیا ہو؟ تمہاری

حالت تو یہ ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو اور قیامت کا انتظار کر رہے ہو۔

اس قوم کا نفع بھی ایک ہے، نقصان بھی ایک ہے، اللہ، رسُول، آخرت، دین، ایمان غرض سب کچھ ہی تو ایک ہے

ایسے میں اگر خود مسلمان بھی ایک (متحد) ہوتے تو کون سی بڑی بات تھی؟ مگر اس کے برعکس حال یہ ہے کہ کہیں فرقہ بندی اور کہیں ذات پات کا بھگڑا ہے۔ کیا دنیا میں رہنے سہنے کا یہی طریقہ ہے رسُولِ مختار کو چھوڑنے والا کون ہے وقت کی مصلحت پر اپنے عمل کی بنیاد کس نے رکھی ہے، غیروں کا شعار کس کو بھا گیا ہے، اسلاف کے اُصولوں سے کس کی نگاہ بیزار ہو گئی اور اُن کے طریقوں سے کس کو نفرت ہے نہ دل میں سوز ہے اور نہ روح میں احساس ہے بلکہ تمہاری نظر میں محمدؐ کے پیغام کا کچھ بھی لحاظ نہیں رہا۔

مسجدوں میں نماز کی صفیں غریب قائم کرتے ہیں۔ روزہ کی زحمت بھی غریب گوارا کرتے ہیں، ہمارے نام لیوا بھی غریب ہیں۔ بلکہ تمہارا پردہ بھی غریب ہی رکھتے ہیں۔

امیر دولت کے نشے میں ہم سے غافل ہو گئے اسلام بس غریبوں میں رہ گیا ہے۔

ہر مسلمان رگِ باطل کے لیے نشتر تھا (باطل کو مٹانے والا) اور اُس کی زندگی کے آئینے کا جوہر عمل تھا۔ جس طرح جوہر آئینے سے جُدا نہیں ہوتا اسی طرح عمل مسلمان کی زندگی سے جدا نہیں ہوتا اور جس طرح آئینے کی قدر و قیمت جوہر سے ہوتی ہے اسی طرح مسلمان عمل کے ذریعے عزت کے مقام پر فائز تھے۔ ان کو اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ تھا اور تم دوسروں پر بھروسہ کرتے ہو یہ کیسے ممکن ہے کہ بیٹے کو باپ کا علم نہ آتا ہو تو وہ باپ کی علمی میراث کا مستحق قرار دے دیا جائے۔ جس کو دیکھئے تن آسانی میں مبتلا ہے، تم کیسے مسلمان ہو، کیا مسلمانوں کے یہی طور طریقے ہوتے ہیں؟ نہ علی مرتضیٰ رضؓ کا سا فقر ہے نہ عثمان غنی رضؓ کی سی دولت۔ پھر تم کو اسلاف سے کیا نسبت ہے؟

وہ دنیا میں مسلمان ہو کر عزت کے مقام پر پہنچے تھے اور تم قرآن کو چھوڑ کر ذلیل ہو گئے۔ تم آپس میں غضبناک ہو وہ آپس میں رحیم تھے۔ تم خطا کار ہو اور دوسروں کی خطائیں ڈھونڈتے پھرتے ہو۔ اور وہ خطاؤں کو چھپانے والے تھے۔ اس پر بھی

چاہتے ہو کہ ثُریا کی بلندی پر پہنچ جاؤ ۔ پہلے ثُریا پر پہنچنے والا قلبِ سلیم تو پیدا کرو۔
فغفور کا تخت بھی ان کا تھا اور کے کا تخت بھی ان کا تھا۔ یونہی باتیں ہیں کہ تم میں اہمیت ہے ؟ تمہارا شیوہ خود کو فنا کرنا ہے اور وہ خوددار و باغیرت تھے ۔ تم اُخوت سے بھاگتے ہو ۔ وہ اُخوت پہ نثار تھے ۔ تم گُفتار ہی گفتار ہو وہ سراپا کردار تھے ۔

یہ وجہ ہے کہ تم کلی کلی کو ترستے ہو جبکہ تمہارے اسلاف باغوں کے مالک تھے۔ آج غیر قوموں کو ان کی حکایت یاد ہے اور ان کی سچائی صفحۂ ہستی پر نقش ہے (ہمیشہ رہے گی) آج کیا حالت ہے ، ہاتھ بے زور ہیں ۔ دلوں میں اتحاد ہے ۔ اُمّتی پیغمرؐ کے لیے رسوائی کا سبب بنے ہوئے ہیں ۔ بت شکن دنیا سے اٹھ گئے ۔ اب جو ان کے جانشین ہیں وہ بت بنانے والے ہیں ۔ باپ ابراہیمؑ کی طرح بت شکن تھے اور بیٹے آذر کی طرح بت بنانے والے ہیں ۔

شراب پینے والے نئے ہیں ، شراب نئی ہے اور شراب کے خم و ساغر بھی نئے ہیں حرم کعبہ بھی نیا ہے ، بت بھی نئے ہیں ۔ اور تم بھی نئے ہو ۔ (یعنی پہلے خدا کی محبت کی شراب پیتے تھے ، اب دنیا کی محبت کی شراب پیتے ہیں ۔ اسلام سے پہلے کعبہ میں پتھر کے بت تھے اب نئے نئے خیالات اور نظریات کے بت اپنے دماغوں میں سجا لیے ہیں ۔ پھر اسلام سے پہلے کے زمانے میں اور آج کے زمانے میں کیا فرق رہا؟)

صبح کا اٹھنا تمہیں کس قدر گراں گزرتا ہے ! اور جب یہ بات ہے تو تم کو ہم سے محبت کب ہے نیند سے محبت ہے ۔ تمہاری طبیعت ایسی آزاد ہو گئی ہے کہ اس پر رمضان کی قید بھاری ہوتی ہے ۔ اور جب یہ بات ہے تو تم ہی کہو یہ وفاداری کیا ہے ؟ قوم مذہب سے بنتی ہے ۔ مذہب نہیں تو تم بھی نہیں ۔ جس طرح جذبِ باہم نہ ہو تو ستاروں کی انجمن بھی نہیں ہو سکتی ۔ جن کو دنیا میں کوئی کام نہیں آتا وہ تم ہو ۔ جس قوم کو اپنے نشیمن کی پروا نہ ہو وہ تمہیں تو ہو ۔ اور اپنے اسلاف کی قبریں بیچ کھانے والے تم ہی ہو ۔ اور جب یہ بات ہے تو پتھر کے بت مل جائیں گے تو ان کو کیوں

نہیں بیچو گے ۔ بتوں کے ذریعہ بھی اپنے کھانے کمانے کا دھندا کر سکتے ہو ۔

حامد صاحب ! یہ تو بالکل دو ٹوک بات ہے ۔ کہ ہمارے اسلاف نے جو کچھ کیا تھا اس کا صلہ اُن کو مل گیا اور ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کا صلہ ہم کو مل رہا ہے ۔ پھر شکوہ کیسا ! ہم کو اپنے کردار کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہیئے ۔ اپنے اسلاف کے کارناموں کو پیش کر کے شکوہ کرنا تو بڑی بے غیرتی کی بات ہے ۔ ہماری زبوں حالی ہمارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے ۔ ہم نے اسلام کو چھوڑا ۔ اپنے اسلاف کے طور طریق کو خیر باد کہا ——— اور دوسری قوموں کے طور طریق کو اختیار کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھا ۔ پھر بھی شکوہ کریں کہ مسلمان ذلیل ہو گئے ، رسوا ہو گئے ۔ خوار ہو گئے ، تو ہم کو یہ بات زیب نہیں دیتی ۔

ہاں ایک بات اور بتا دیجئے ۔ یہ نظمیں کب کہی گئیں اور ان کو کہاں سنایا گیا ؟

محمود ۔ ۱۹۱۱ء کے ماہ اپریل میں انجمنِ حمایت اسلام کا جو سالانہ اجلاس ہوا ، اس پر حضرت علامہ نے اپنی مشہور نظم " شکوہ " ریواز ہوسٹل کے صحن میں پڑھی ۔ اس وقت ان کے والد محترم بھی جلسے میں تشریف رکھتے تھے ۔ اور اس نظم کو سُن کر برابر روتے رہے ۔ چند ماہ بعد موچی دروازے کے باہر ایک بہت بڑے جلسے میں علامہ نے نظم " جواب شکوہ " سنائی ۔ یہ جلسہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے زیرِ اہتمام " جنگ بلقان " کے سلسلے میں ہوا تھا " تاکہ ترکوں کے لیے چندہ جمع کیا جائے ۔ نظم کے ختم ہونے پر اس کی ہزاروں کاپیاں فروخت ہو گئیں ۔ اور تمام رقم بلقان فنڈ میں دیدی گئی

حامد ۔ محمود صاحب ! بہت بہت شکریہ ! آج آپ سے مل کر بڑی معلومات حاصل ہوئیں ۔ جزاک اللہ ۔

الفاظ کے معنی

لفظ	معنی
شُدبُد	معمولی پڑھنے لکھنے کی قابلیت ۔
فلسفیانہ	فلسفیوں جیسے، مُراد فلسفے کے خیالات ۔
عارفانہ	عارفوں (خدا کے پہچاننے والوں) کے ، معرفت کے خیالات ۔
رجحان ۔	جھکاؤ، میلان، رغبت
موقوف	منحصر
گرمیٔ محفل	محفل کی رونق
یکسانیت	ایک سا ہونا ۔ برابری
مسدّس	نظم کی ایک قسم جس کے ہر بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں
عروج	بلندی
اسلاف	سلف کی جمع ہے اگلے وقتوں کے لوگ، باپ دادا ۔
اپنا سا مُنہ لیکے رہ جانا	شرمندہ ہونا، خفیف ہونا
بحرِ ظُلمات	بحرِ اُوقیانوس ۔
نیازمندی	عاجزی
باطل	جو حق نہ ہو، غلط، جھوٹا

لفظ	معنی
آستانہ	چوکھٹ، درگاہ
پیکر	صورت، شکل، مجسمہ، بت
پاش پاش کر دیا	ٹکڑے ٹکڑے کر دیا
سرنگوں	اوندھا، سر کے بل لٹکا ہوا ۔ ذلیل
طنطنہ	شان و شوکت
شکوہ اللہ سے خاکم، بدہن ہے مجھ کو	میرے مُنہ میں خاک ہو کہ مجھے اللہ سے شکوہ ہے!
ہم سخن	ہم کلام
دو ٹوک بات	صاف صاف بات
سر بکف	سر ہتھیلی پر رکھے ہوئے
اِتحاد	بے دینی، دین سے پھرنا سیدھے راستے سے کترا کر چلنا ۔
اتحاد	میل جول، دوستی، محبت ۔
اِحکام	حکم کی جمع ہے ۔
حضور میں	روبرو، سامنے ۔
کردار	عمل
زبوں حالی	بدحالی ۔ بُرا حال ہونا
اہتمام	انتظام

لفظ	معنی	لفظ	معنی
بے حمیّتی	بے غیرتی	اختتام	خاتمہ ۔

مکالمے کا مختصر خلاصہ :-

زندگی عمل سے بنتی ہے ۔ عزت و خوشحالی، کوشش، محنت اور اچھے اصولوں پر عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے ۔ اور مسلمانوں کے لیے تو خدا اور رسُول کے بتائے ہوئے اتنے اچھے اصُول موجود ہیں کہ جن پر عمل کر کے ہمارے اسلاف اقبال مندی و خوشحالی کے نہایت بلند مقام پر پہنچ گئے تھے ۔ اس لیے ہم کو چاہیئے کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کریں ۔ اور اپنے بزرگوں کے طور طریق اختیار کرتے ہوئے آپس میں اتحاد اور محبت کے ساتھ رہیں ۔ دورِ حاضر کے علوم میں بھی کمال پیدا کر کے دوسری قوموں سے آگے نکل جانے کی کوشش کریں البتہ دوسری قوموں کی تہذیب اور تمدن پر فریفتہ نہ ہوں ۔ اور اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو پھر ہم کو شکوہ شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے ۔

مشق

۱۔ اقبال نے شکوہ میں مسلمانوں کے جو کارنامے بیان کیے ہیں ان کو مختصر طور پر بیان کرو ۔

۲۔ شکوہ کے جواب میں خدا کی طرف سے جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ پیش کرو ۔

۳۔ "شکوہ" اور جواب شکوہ" کب لکھے گئے اور کہاں سنائے گئے ۔

۴۔ نیچے لکھے ہوئے الفاظ کے معنی بتاؤ اور انہی کو اپنے جملوں میں استعمال کرو ۔

شُدبُد ۔ رجحان ۔ گرمیٔ محفل ۔ عروج ۔ زوال ۔

۵ ۔ نیچے کے اشعار کو زبانی یاد کرو اور اپنی کاپی میں صاف صاف خوشخط لکھو ۔

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پہ مرتی۔ بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

ٹل نہ سکتے تھے، اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی، تو بگڑ جاتے تھے تیغ کیا چیز ہے، ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقشِ توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی، قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی، ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی، ایک ہوئے

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

(شکوہ)

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا، کس نے نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا، کس نے
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا، کس نے میرے قرآن کو سینوں سے لگایا، کس نے
تھے تو آبا وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

منفعت ایک ہے، اس قوم کی، نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، قرآن بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے، جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو۔ پھر پسر قابل میراثِ پدر کیوں کر ہو؟

چاہتے سب ہیں، کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم پہلے ویسا کوئی پیدا، تو کرے قلبِ سلیم

(جواب شکوہ)

۱۷۔ علاّمہ اقبال کے ارشادات

(الف) ایک دفعہ گھر میں کام کرنے والی ملازمہ کا بچہ صحن میں کھیل رہا تھا۔ علاّمہ نے اُسے دیکھا تو فرمایا:۔

جاوید اور اس بچے میں اس وقت کوئی خاص فرق نہیں۔ کیوں کہ سب بچے برابر ہوتے ہیں۔ لیکن بڑے ہونے پر ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہو جائے گا۔ اس لیے نہیں کہ جاوید کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے بلکہ اس لیے کہ اُس کو اپنی زندگی میں ایسے مواقع میسر آئیں گے کہ وہ پڑھ لکھ کر ایک بڑا آدمی بن سکے گا۔ لیکن یہ بچہ اپنی زندگی میں ایسے موقعے میسر نہ آنے کی وجہ سے وہیں کا وہیں رہ جائے گا۔ حالانکہ اگر اس کو بھی ایسے موقعے مل جائیں تو اس کے پوشیدہ جوہر بھی کھل سکتے ہیں۔ اور سنگِ راہ کے بجائے یہ بھی عزت و شہرت کے آسمان کا درخشندہ ستارہ بن سکتا ہے۔" [1]

(ب) میکلوڈ روڈ پر علاّمہ کی کوٹھی کے پچھواڑے دیال سنگھ کالج کا وسیع میدان تھا۔ جس میں شام کے وقت کالج کے لڑکے کھیلا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی فٹ بال یا کرکٹ کی گیند اُچھل کر کوٹھی کے صحن میں جا گرتی تھی۔ ان کی بیگم نے کئی بار حضرتِ علاّمہ کو کالج کے پرنسپل سے اس کی شکایت کرنے کو کہا۔ مگر آپ نے ہمیشہ درگزر سے کام لیا اور بیگم کو یہ کہہ کر سمجھایا کہ:۔

"اس طرح بچوں پہ پابندیاں لگانے سے کیا حاصل ہو گا ان کو آزادی سے کھیلنے

---

[1] اقبال درونِ خانہ

دو۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ قوم کے نونہال غلط قسم کے اشغال چھوڑ کر اب صحت مند کھیلوں کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ ہمیں ان کی راہ میں روڑے اٹکانے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ کیا ہوا اگر کبھی کبھار ان کی گیند ہمارے صحن میں آجاتی ہے! اس سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوتا اور کچھ ہو بھی جائے تو یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں جتنا ہماری آئندہ نسل کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔"[1]

(ج) ایک دفعہ طالب علموں کی ایک جماعت کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:۔

"مسلمان کو چاہیئے کہ وہ ذات پات کی لعنت سے دور رہے۔ مسلمان کی ذات صرف اسلام ہے اس لیے اس کو فخر کے ساتھ کہنا چاہیئے کہ میں مسلمان ہوں۔ اور بس۔

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

رنگ، نسل اور خاندان اور قبیلے وغیرہ کے امتیازات کو بُت سمجھ کر توڑ دینا چاہیئے اور اپنے کو ملت اسلامیہ کا ایک فرد سمجھنا چاہیئے اور بس۔

اسی طرح ہر مسلمان کو خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو بیکار نہ رہنا چاہیئے۔ اپنے دست و بازو سے کمانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

(د) وفات سے چند روز پیشتر علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد مرحوم سیالکوٹ سے ان کی مزاج پرسی کے لیے آئے اور ان کو دلاسا دینے لگے تو انہوں نے فرمایا:

بھائی صاحب! میں موت سے نہیں ڈرتا۔ انشاء اللہ مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کروں گا۔"

اور پھر اپنا فارسی کا ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ ہے کہ:" میں تم کو مومن کی پہچان بتاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جب موت آتی ہے تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔"[2]

(ھ) ایک موقعہ پر فرمایا:۔

---

[1] اقبال درونِ خانہ

[2] روزگار فقیر

"انسان کو دنیا میں عمل کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اپنی پیدائش کے مقصد کو سمجھو اور اس کے لیے کوشش کیے جاؤ" [1]

(ز) ایک دفعہ فرمایا:۔

"دنیا میں بڑے بڑے رفارمر اور فلسفی ہوئے ہیں اور انہوں نے ملک و قوم کی اصلاح کے لیے اصول اور نظریات بھی وضع کیے ہیں مگر ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی نے اپنے وضع کیے ہوئے اصول اور نظریات پر خود بھی عمل کیا ہو بس ایک ہی ہستی ایسی گزری ہے جس نے اپنے دیئے ہوئے پیغام پر پہلے خود عمل کر کے دکھایا۔ اور وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے" [2]

الفاظ کے معنی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
سنگِ راہ	راستے کا پتھر	طبقہ	گروہ، جماعت
پچھواڑے۔	پچھلی طرف	تصانیف	کتابیں، تصنیف کی جمع ہے
درگزر کرنا	معاف کرنا، ٹال دینا	رفارمر	اصلاح کرنے والا
اشغال	شغل کی جمع ہے، کام	نظریے	خیالات، اصول وغیرہ
حوصلہ افزائی	ہمت بڑھانا	وضع کرنا	بنانا
مسئلہ	معاملہ، سوال	وضع کیے ہیں	بنائے ہیں۔
لعنت	پھٹکار		

---

[1] ۔ سیرت اقبال [2] ۔ ایضاً

مشق

۱ علامہ اقبال کے ارشاد کے مطابق وقت کے ساتھ جاوید اور ملازمہ کے بچے کے درمیان زمین و آسمان کا فرق کیسے ہو جائے گا ؟

۲۔ صحن خانہ میں گیند کے آکر گرنے پر جب بیگم نے علامہ سے اس کی شکایت کالج کے پرنسپل سے کرنے کو کہا تو علامہ نے بیگم کو کیا جواب دیا ؟

۳۔ نیچے لکھے ہوئے جملوں میں خالی جگہوں کو پُر کرو۔

(الف) بڑے ہونے پر دونوں میں ..... فرق ہو جائے گا۔

(ب) ہمیں ان کی راہ میں روڑے اٹکانے کی بجائے ان کی ..... کرنی چاہیئے۔

(ج) ہمیں اپنے دست و بازو سے ..... کوشش کرنی چاہیئے۔

۴۔ ذیل کے جملوں کو اپنی کاپی میں صاف صاف خوشخط لکھو۔

(الف) یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ قوم کے نونہال غلط قسم کے اشغال چھوڑ کر صحت مند کھیلوں کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔

(ب) ہر مسلمان کو اپنے دست و بازو سے کمانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

۱۸۔ اقبال کی قابلِ رشک عادات

۱۔ حُبِّ رسولؐ

اقبال کو حضورؐ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی محبت تھی۔ جب کبھی حضورؐ کا ذکر ہوتا بے تاب ہو جاتے اور دیر تک آنکھوں سے آنسو جاری رہتے۔ اگر کبھی حضورؐ کی سیرتِ مبارکہ کے عنوان پر تقریر کرتے تو وہ ایسی موثر ہوتی کہ سُننے والا حضورؐ کا گرویدہ ہو جاتا۔ آپ کے سامنے کوئی مسلمان "محمدؐ صاحب" یا ایسا ہی کوئی اور لفظ حضورؐ کے نام کے ساتھ ملا کر بولتا تو اس سے آپ کو اتنی تکلیف ہوتی کہ اس کا اثر کئی دن تک رہتا۔ خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کی "مسدس" کے یہ بند آپ کو بہت پسند تھے۔ ان کو خود بھی پڑھتے رہتے اور دوسروں سے بھی پڑھوا کر سنا کرتے تھے:۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولا

خطاکار سے درگزر کرنے والا — بدَ اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مِس خام کو جس نے کُندن بنایا — کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب، جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا — پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا..
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

اشعار کا مطلب یہ ہے کہ " تمام نبیوں کو خُدا کی طرف سے الگ الگ لقب ملے ہیں . ہمارے نبیؐ کو رحمۃٌ للعالمین کا لقب ملا ہے . لہٰذا سارے نبیوں میں رحمت کا لقب پانے والے صرف آپؐ ہیں . آپؐ غریبوں کی مرادیں بر لانے والے، مصیبت میں غیروں کے کام آنے والے اور اپنے تو اپنے پرایوں کا بھی غم کھانے والے تھے. آپؐ کی ذاتِ گرامی غریبوں اور کمزوروں کا ٹھکانہ تھی . آپؐ یتیموں کے وارث اور غلاموں کے مولیٰ تھے .

آپؐ خطاکاروں کو معاف کرنے والے اور بُرا چاہنے والوں کے دلوں میں گھر کرنے والے ، جھگڑوں کو مٹانے والے اور قبیلوں کو آپس میں ملانے والے تھے.

آپؐ حرا سے اُتر کر قوم کی طرف آئے اور اپنے ساتھ ایک کیمیا کا نسخہ بھی ، لائے . یعنی قرآن . یہ وہ نسخہ ہے جس نے تانبے (اُس وقت کے ناکارہ انسان) کو کندن بنا دیا، انسان جو نہایت ذلیل اور ناکارہ ہو چکا تھا اُس کو انتہائی بلند مقام پر پہنچا دیا . کھرے اور کھوٹے کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا ، جس طرح کسوٹی بتا دیتی ہے کہ یہ سونا کھرا ہے اور وہ کھوٹا ہے اسی طرح قرآن نے بھی اچھوں کو بروں سے الگ کر دیا . جس جس نے قرآن سُن کر اسلام قبول کر لیا وہ ایک طرف ہو گئے اور جنہوں نے قرآن کو سننے کے بعد بھی اپنی روش نہیں چھوڑی وہ دوسری طرف ہو گئے . وہ عرب جس پر صدیوں سے جہالت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا . اس کی بہت جلد، کایا پلٹ دی . اور اب بیڑے (عرب) کو طوفان کی موجوں کا ڈر نہیں رہا . اس لیے کہ ہوا کا رُخ بدل گیا ، جہالت کی تاریکی دُور ہو گئی اور اسلام کا نور آگیا . اور اسلام نے انسان کو ہر طرح کی مصیبت سے محفوظ کر دیا ،،

مولانا حالی کے ان اشعار کو سُن کر، جن کا ہم نے ابھی ابھی مطلب بیان کیا ہے اقبال کا دل بھر آتا تھا اور وہ بے اختیار رو پڑتے تھے . اسی طرح اگر کوئی عمدہ

نعت پڑھتا تو آپ کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔

اقبال نے اپنی ہر کتاب میں حضورؐ کی شان میں نعت ضرور شامل کی ہے اور ایسے سوز و گداز اور والہانہ انداز میں لکھی ہے کہ اس کا ایک ایک حرف تیر و نشتر کی طرح دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔

آخر عمر میں اقبال کو زیارتِ حرمین (مکہ و مدینہ) کا شوق حد سے زیادہ ہو گیا تھا چنانچہ انہوں نے اسی شوق میں ایسے شعر بھی لکھنے شروع کر دیئے تھے جیسے آپ مکہ اور مدینہ کے سفر میں ہیں۔ اور وہاں کی کیفیتوں سے متاثر ہو کر اشعار کہہ رہے ہیں، ایسے تمام اشعار ان کی کتاب 'ارمغانِ حجاز' میں موجود ہیں جو اُن کے انتقال کے بعد شائع ہوئی ہے۔ لیکن افسوس کہ ان کی شدید اور طویل علالت نے جو تقریباً تین سال تک رہی اور آخر ان کی جان لے کر ٹلی، ان کو زیارت حرمین کا موقع نہیں دیا اور وہ یہ حسرت اپنے ساتھ ہی لے گئے۔

(۲) قرآن کے ساتھ بے حد محبت۔

اقبال کو قرآن سے بڑی محبت تھی بچپن ہی سے روزانہ صبح کے وقت قرآن کی تلاوت نہایت پابندی سے کیا کرتے تھے اور اُونچی آواز میں نہایت دلکش لہجے میں قرآن پڑھا کرتے تھے اُن کے والد اُن کے قرآن پڑھنے کو سنتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے۔ ان کے اسی ذوق و شوق کو دیکھ کر ہی والد نے ان کو نصیحت کی کہ بیٹے! جب قرآن پڑھو تو یہ سمجھ کر پڑھو کہ یہ تم پر ہی اُترا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔ چنانچہ اقبال نے اپنے باپ کی نصیحت پر عمل کیا۔ ان کا یہ حال تھا کہ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے کبھی وجد میں آجاتے اور کبھی روتے روتے ان کی ہچکی بندھ جاتی تھی۔ روتے جاتے اور پڑھتے جاتے۔ یہاں تک کہ قرآن کے ورق اُن کے آنسوؤں سے تر ہو جاتے۔ عمر بھر اُن کا یہی دستور رہا۔ آخری عمر میں جب گلا خراب ہو جانے کی وجہ سے ——— ان کی آواز بیٹھ گئی تو ان کو اس بات کا بڑا غم تھا کہ وہ حسب معمول اُونچی آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتے۔

یہ تو قرآن کی تلاوت کا حال تھا۔ رہا قرآن کا سمجھنا تو چونکہ انہوں نے اس کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کے معنی و مطالب کی تہ تک پہنچے تھے اس لیے انہوں نے اس کتاب کی تعریف کثرت اور ایسے موثر انداز اور دل نشیں پیرایے میں کی ہے کہ دل میں اتر تی چلی جاتی ہے پھر ایسی مدلّل کہ کسی کو انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔

۳۔ سحر خیزی :-

اقبال کی ہمیشہ سے یہ عادت تھی کہ صبح چار بجے اور کبھی تین بجے اُٹھ بیٹھتے تھے۔ اور پھر نہیں سوتے تھے۔ بالعموم فجر کی نماز پڑھنے کے بعد قرآن کی تلاوت کرنے بیٹھ جاتے اور دن چڑھے تک کرتے رہتے۔ ان کی سحر خیزی کا یہ حال تھا کہ یورپ کے قیام کے دوران بھی اس میں فرق نہ آیا۔ چنانچہ ایک شعر میں فرماتے ہیں :-

زمستانی ہوا میں، گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

آدابِ سحری :- صبح جلدی اُٹھنا، حوائجِ ضروری سے فارغ ہو کر فجر کی نماز پڑھنا اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد قرآن کریم کی تلاوت کرنا وغیرہ۔

فرماتے ہیں، اگرچہ لندن کے موسمِ سرما کی ہواؤں میں تلوار کی سی تیزی ہوتی تھی مگر میں نے وہاں بھی صُبح جلدی اُٹھنا، نمازِ فجر ادا کرنا اور نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کرنا نہیں چھوڑا۔

غرض کہ اقبال کی صُبح جلدی اُٹھنے کی عادت اس قدر پختہ ہو گئی تھی کہ اُس میں کسی حال میں کوئی فرق نہ آیا۔ پھر یہی نہیں کہ وہ معمول کے ساتھ صُبح جلدی اُٹھتے تھے بلکہ اپنے کلام میں جابجا صُبح جلدی اُٹھنے کی تعریف کی اور اس کے فائدے ایسے موثر الفاظ میں بیان کیے کہ اس کو پڑھ کر لوگوں کے دلوں میں سحر خیزی کا شوق پیدا ہوتا ہے چونکہ سحر خیزی ان کا حال تھا اس لیے ان کے اس بیان میں ایسی تاثیر کا ہونا قدرتی بات ہے۔

۴۔ سادگی :۔

سادگی بھی اقبال کی ایسی صفت تھی جس کی کوئی مثال اُن کے درجے بلکہ اُن سے کم درجے کے کسی شخص میں بھی نہیں مل سکتی۔ گرمی کے موسم میں گھر میں سفید قمیص اور تہمد۔ سردی کے موسم میں کمبل اوڑھ لیتے۔ البتہ ہائی کورٹ جانا ہوتا یا کسی خاص تقریب میں شرکت ضروری ہوتی تو سوٹ پہن لیتے۔ شلوار بھی پہنتے تھے اور شلوار کے ساتھ چھوٹا کوٹ بھی پہنا ہے۔ اور شیروانی بھی۔ سر پہ ترکی ٹوپی رکھتے تھے۔ جب ترکی ٹوپی ملنی مشکل ہوگئی تو قراقلی نما سیاہ ٹوپی پسند فرمائی۔ کبھی کبھی لنگی اور کلاہ کا بھی استعمال کر لیتے تھے۔ تکلف کا لباس انہوں نے کبھی نہیں پہنا۔ تکلف سے انہیں طبعاً نفرت تھی۔ ان کی سادگی بالکل فطری تھی۔ وہ لباس کو تن ڈھانکنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ جو لباس وقت اور ماحول کے مطابق یہ مقصد پورا کر سکتا تھا وہ اسی پر مطمئن رہتے۔ ایسے معاملات میں مین میکھ نکالنے سے ان کی طبیعت اکتاتی تھی۔

یہی حال خورد نوش اور زندگی کے دوسرے امور کا تھا۔ کھانے میں جو کچھ مل گیا خوش ہو کر کھالیا۔ اور خدا کا شکر ادا کیا۔ بلکہ کھانا وہ ایک مدت سے ایک ہی وقت کھاتے تھے۔ چائے بھی نہیں پیتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی رات کو سونے سے پہلے نمکین چائے پی لیتے تھے۔

اتنے بلند پایہ فلسفی اور عالی مرتبہ مفکر ہونے کے باوجود تنہائی پسند نہ تھے۔ ہر قسم کے لوگوں سے ملتے اور ہر شخص سے اس کے مذاق کے مطابق گفتگو کرتے۔ جس سے بھی ملتے انتہائی بے تکلفی کے ساتھ ملتے۔ ان کی صحبت میں بیٹھنے والا شخص ان کے انکسار، سادگی اور اخلاق کی خوبی کا بڑا گہرا اثر دل پہ لے کے اُٹھتا۔ بلکہ اپنی خاکساری کے اظہار کے لیے وہ اپنے مخاطب سے ایسے سوالات کرتے گویا اس سے مستفیض ہو رہے ہیں۔

ہمیشہ کرایے کے مکان میں رہے۔ آخر میں اپنا ذاتی مکان بنوا لیا تھا۔ مکان پر آنے میں کسی کو کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ ان کا دروازہ سب کے لیے ہر وقت کھلا

رہتا تھا۔ جو چاہتا بلا تکلّف آپ سے آکر ملتا اور ہم کلام ہو جاتا۔ جو سوال چاہتا کرتا پھر مکان اور اس کا آس پاس سادگی کا مکمل مرقع ہوتا تھا۔ نہ مکان کے باہر کسی قسم کی آرائش و زیبائش نہ اندر فرنیچر کے ٹھاٹ باٹ۔ غرضکہ ہر طرح کی سادگی۔ اُن کی زندگی کا خاصہ بن چکی تھی۔

۵۔ قناعت۔

"قناعت" کے یہ معنی ہیں کہ انسان اپنی محنت اور کوشش سے جو کچھ حاصل کرے اس پر خوش رہے اور ضرورت سے زیادہ کے لیے دوڑ دھوپ نہ کرے۔ علامہ اقبال میں قناعت کی صفت کمال درجے کی تھی اور وہ اس پر سختی سے قائم تھے۔

جب وکالت کرتے تھے تو صرف اتنے پیسوں کا کام لیتے تھے جس سے ان کی زندگی کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ اگر کوئی مقدمہ جھوٹا یا کمزور نظر آتا تو اسے لینے سے انکار کر دیتے۔ اور مقدمے کے فریق کو سمجھاتے کہ تمہارے "کیس" میں جان نہیں ہے۔ خواہ مخواہ روپیہ ضائع نہ کرو۔ ایک دفعہ ایک شخص اپنے مقدمے کی پیروی کرانے کے لیے آیا۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مقدمہ بالکل بے جان ہے وہ شخص ضد کر رہا تھا کہ آپ اپنی مُنہ مانگی فیس لیں اور پیروی کریں۔ اگر فیصلہ میرے خلاف بھی ہوا تو مجھے افسوس نہ ہوگا۔ مگر انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حرام کی کمائی کا قائل نہیں۔ آخر بڑی ردّوکد کے بعد وہ شخص ناراض ہو کر چلا گیا۔

آخری عمر میں طویل علالت کی وجہ سے انہیں وکالت چھوڑنی پڑی۔ تین چار سال بڑی پریشانی کے عالم میں گزرے۔ کیونکہ حصولِ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ جب یہ خبر نواب صاحب بھوپال کو ملی تو انہوں نے محض اپنے تعلقِ خاطر کی بنا پر اپنی جیب خاص سے پانچسو ۵۰۰ روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ علامہ ——— مرحوم پہلے اس کیلئے رضامند نہ تھے مگر اُن کے عزیز دوست سر راس مسعود اور خود نواب صاحب کے یقین دلانے پر کہ یہ ریاست کی طرف سے نہیں بلکہ ایک مخلص دوست کا اظہارِ عقیدت

ہے تو انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ اس کے بعد متعدد عقیدت مندوں نے اپنی طرف سے مزید وظائف کی پیشکش کی لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ، میری ضرورت کے مطابق خداوند کریم نے بڑا اچھا انتظام کر دیا ہے[1]"

الفاظ کے معنی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
موثر	اثر کرنے والا	قرن	صدی
گرویدہ	عاشق بہت زیادہ چاہنے والا	جہل	جہالت
		حرا	مکے میں ایک پہاڑ ہے جس کی ایک غار میں حضورؐ نبوت سے پہلے عبادت کیا کرتے تھے
ملجا و ماویٰ	ٹھکانہ		
مولیٰ	آقا	نسخہ کیمیا	کیمیا کا نسخہ۔ یہاں قرآن مراد ہے
بداندیش	برا چاہنے والا، دشمن		
مفاسد	مفسدہ کی جمع ہے۔ لڑائی جھگڑے، بگاڑ اور خرابی کی باتیں۔	بے اختیار	خود بخود، بلا ارادہ
		ناگزیر	ضروری
قبائل	قبیلے	دل بھر آیا	غمگین ہونے سے آنکھوں میں آنسو بھر آنا۔
مس خام	کچا تانبا	والہانہ	انتہائی محبت والا
کندن	خالص سونا	شغف	بے حد دلچسپی، لگاؤ، شوق۔
وجد	بے خود ہو کر جھومنا		
مدلل	دلیل سے ثابت کیا ہوا		

---

[1] ۔ روزگار فقیر حصہ دوم صد ۴۷۰ ۔

لفظ	معنی
تہجد ۔	نوافل جو اکثر نیک لوگ آدھی رات کے بعد پڑھا کرتے ہیں ۔

مشق

۱۔ اس کتاب میں اقبال کی جتنی " قابلِ رشک عادات " بیان کی گئی ہیں ۔ اُن کے عنوان بتاؤ ۔

۲۔ حضور سرورِ عالمؐ کے ساتھ اقبال کی محبت ان کی کن باتوں سے ثابت ہوتی ہے ؟

۳ ۔ قناعت بھی اقبال کی ایک صفت تھی ۔ دو ایک مثالوں سے ان کی قناعت ثابت کرو ۔

۴ ۔ اقبال کی سادگی کی دو ایک مثالیں بیان کرو ۔

۵ ۔ نیچے لکھے ہوئے الفاظ کے معنی بتاؤ اور اپنے جملوں میں استعمال کرو ۔

گرویدہ ۔ بداندیش ۔ بے اختیار ۔ دل بھر آنا ۔ والہانہ ۔

۶ ۔ ان جملوں کو صاف صاف اور خوشخط لکھو ۔

(الف) اقبال کو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی محبت تھی ۔

(ب) سارے نبیوں میں رحمت کا لقب پانے والے صرف ہمارے نبیؐ ہیں ۔

(ج) اقبال قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے کبھی وجد میں آجاتے تھے اور کبھی روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں ۔

۱۹۔ علامہ اقبال کے خطوط

لسان العصر اکبر الہ آبادی کے نام

لاہور۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۱۵ء

مخدومی! تسلیم

آپ کا نوازش نامہ مل گیا تھا۔ مجھے اس بات سے تردد ہے کہ آپ کی علالت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد صحتِ کامل عطا فرمائے۔ آپ کے خطوط سے مجھے نہایت فائدہ ہوتا ہے۔ اور مزید غور و فکر کی راہ کھلتی ہے اسی واسطے میں خطوط کو محفوظ رکھتا ہوں کہ یہ تحریریں نہایت بیش قیمت ہیں۔ اور بہت لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔ واعظِ قرآن بننے کی اہلیت تو مجھ میں نہیں ہے ہاں اس مطالعہ سے اپنا اطمینانِ خاطر روز بروز ترقی کرتا جارہا ہے۔ گو عملی حالت کے اعتبار سے بہت سست واقع ہوا ہوں۔ آپ دعا فرمائیں۔

قرآن کے متعلق عربی میں بعض نہایت عمدہ کتابیں ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ لاہور میں دستیاب نہیں ہوتیں۔ جرمنی کے علما نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر جنگ کی وجہ سے وہاں سے نہیں آسکتیں۔ انشاء اللہ بعد از جنگ بہت سی کتابیں علومِ قرآن کے متعلق وہاں سے منگواؤں گا۔

آپ کا خادم

محمدؐ اقبال۔

سیالکوٹ
۱۳ اگست ۱۹۱۸ء

مخدومی !

السلام علیکم ۔ والا نامہ لاہور سے ہوتا ہوا ملا ۔

الحمد للہ کے جناب کا مزاج بخیر ہے ۔ واقعی آپ نے سچ فرمایا کہ ہزار کُتب خانہ ایک طرف اور باپ کی شفقت ایک طرف ۔ اسی واسطے تو جب کبھی موقع ملتا ہے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور پہاڑ پر جانے کے بجائے اُن کی گرمیٔ صحبت سے مستفید ہوتا ہوں ۔

پرسوں شام کھانا کھا رہے تھے اور کسی عزیز کا ذکر کر رہے تھے جس کا حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا ۔ دورانِ گفتگو میں کہنے لگے معلوم نہیں بندہ اپنے رب سے کب کا بچھڑا ہے ۔ اس خیال سے اس قدر متاثر ہوئے کہ تقریباً بے ہوش ہو گئے اور رات دس گیارہ بجے تک یہی کیفیت رہی ۔ یہ خاموش لیکچر ہیں جو پیرانِ مشرق سے ہی مل سکتے ہیں یورپ کی درس گاہوں میں ان کا نشان نہیں ۔

والدِ مکرم سلام شوق عرض کرتے ہیں ۔

مخلص محمد اقبال ۔

(بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے نام)

لاہور
۹ ستمبر ۱۹۳۷ء

مخدومی جناب مولوی صاحب !

تسلیم ۔

آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے جس کے لیے بہت شکر گزار ہوں ۔ اُردو زبان

کے تحفظ کے لیے جو کوششیں آپ کر رہے ہیں ان کے لیے مسلمانوں کی آئندہ نسلیں آپ کی شکر گزار رہیں گی۔ مگر آپ سے زیادہ اس بات کو کون سمجھ سکتا ہے کہ زبان کے بارے میں سرکاری امداد پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ زبانیں اپنی اندرونی قوتوں سے نشوونما پاتی ہیں۔ اور نئے نئے خیالات و جذبات کے ادا کر سکنے پر ان کی بقا کا انحصار ہے۔ آپ کی کوششوں کا مرکز وہی پروگرام ہونا چاہیے جو آپ علی گڑھ میں وضع کر چکے ہیں۔ کبھی کبھی پنجاب کا دورہ بھی لازم ہے۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا مخلص۔

محمد اقبال

(محمد جمیل کے نام)

لاہور

۱۸ فروری ۱۹۲۹ء

مائی ڈیر مسٹر جمیل!

ابھی ابھی آپ کا نوازش نامہ اور تصویری کارڈ موصول ہوئے۔ بہت بہت شکریہ قبول فرمائیے۔ آپ تک یہ اطلاع پہنچانا میرے لیے باعثِ مسرت ہے کہ میں آزمائش میں ثابت قدم نکلا اور اب باوجود مالی مشکلات کے ایران اور ترکی کے سفر کی تیاری میں مصروف ہوں۔ خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ اس سفر کے لیے جو میں محض اسلام اور مسلمانوں کی بہتری اور بلندی کے لیے اختیار کر رہا ہوں۔ زادِ راہ میسر آجائے گا۔

مجھے اس اطلاع سے بے حد مسرت ہوئی کہ میرا سفرِ میسور مسلم نوجوانوں میں تاریخی تحقیق کے شوق و ذوق کا باعث ہوا۔ سیٹھ آبا صاحب نے مجھے سلطان ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ سے متعلق ایک قلمی مسودہ جو ایک شخص کے پاس ہے اور جو ہمیں سلطان کے

مقبرہ پر ملا تھا، ارسال کرنے کا وعدہ فرمایا تھا مجھے امید ہے کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہوں گے۔ اُن تک میرا سلام شوق پہنچا دیجیے اور اُن سے کہیے کہ اسلام کی خدمت کے لیے اُن کے ذوق و شوق نے میرے دل پر ایک ایسا اثر پیدا کیا ہے جو کبھی محو نہ ہوگا۔ میں دست بدعا ہوں کہ اُنہیں بنگلور کے حاجی اسماعیل کی سی عظمت و منزلت حاصل ہو۔

مخلص۔ محمد اقبال

پروفیسر محمد اکبر منیر کے نام

لاہور
۴ اگست ۱۹۲۰ء

مکرّم بندہ

السّلام علیکم۔ آپ کا خط ابھی ابھی ملا ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ ایران جانے والے ہیں۔ شیراز فارسیوں کے کلچر کا مرکز ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہاں کا قیام آپ کے لیے بہت مفید ہوگا۔

حال کی ایرانی شاعری میں کچھ نہیں۔ البتہ اس قوم کی بیداری کے شواہد کے طور پر اسے ضرور پڑھنا چاہیے علاوہ اس کے زبان کی تحصیل کے لیے بھی مفید ہے۔ ایرانی، شاعری کا تو قاآنی پر خاتمہ ہو گیا۔

خالص فلسفے میں اگر کتابیں آپ کو مل جائیں تو انہیں جمع کرتے جائیے، قلمی ہوں یا مطبوعہ۔ تصوّف کی کتُب کا جمع کرنا بھی مفید ہوگا حال کے ایرانی حکماء میں ہادی سبزواری مشہور ہیں۔ ان کی کتاب "اسرار الحکم" میری نظر سے گزری ہے۔ محض افلاطونیت کا چربہ ہے اور بس۔ حال کے حکماء میں سے اگر کسی کی تصنیفات آپ کے ہاتھ آجائیں تو غنیمت ہے۔ فلسفے اور تصوّف کی کتابوں پر اگر خرچ ہو تو پروا نہ کیجیے اس میں مجھے بھی شریک سمجھیے۔ البتہ کتاب خریدنے میں احتیاط لازم ہے کیونکہ نوّے فی صد کتابوں میں کچھ بھی،

نہیں ہوتا ۔ لوگ نام کی وجہ سے خرید لیتے ہیں ۔

ایک کتاب غالباً "لطائف غیبی" نام کی ایران میں شائع ہوئی تھی ۔ پروفیسر براؤن نے "لٹریری ہسٹری" میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ یہ کتاب ان اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی ہے جو وقتاً فوقتاً خواجہ حافظ پر کیے گئے ہیں ۔ اگر کہیں سے دستیاب ہو جائے تو میرے لیے خرید کر بھیج دیجئے ۔

اُمید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔

محمد اقبال

الفاظ کے معنی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
شفقت	مہربانی	مستفید ہوتا ہوں	فائدہ اُٹھاتا ہوں ۔
دورانِ گفتگو	گفتگو کے وقت ، گفتگو کے درمیان	پیرانِ مشرق	مشرق کے رہنے والے بزرگ ۔
تردّد	فکر	محو نہ ہوگا	نہیں مٹے گا
علالت	بیماری	منزلت	مرتبہ
واعظِ قرآن	قرآن کا وعظ کہنے والا	دست بدعا ہوں	دُعا کرتا ہوں ۔
تحفظ	حفاظت کرنا ، حفاظت	نشو و نما پاتی ہیں	بڑھتی اور ترقی کرتی ہیں ۔

مشق

۱۔ اقبال نے اکبر الٰہ آبادی کو اپنے والد محترم کے بارے میں جس واقعے کا ذکر کیا ہے اُس کو بیان کرو ۔

۲۔ اقبال نے اکبر کے خطوط کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا ہے ؟

۳۔ اقبال نے بابائے اُردو مولوی عبدالحق کو اُردو زبان کے بارے میں کیا لکھا ہے ؟

۴۔ اقبال ایران اور ترکی کا سفر کس غرض سے کرنا چاہتے تھے ۔

۵۔ نیچے لکھے ہوئے ادھورے جملوں کو پورا کرو :۔

(الف) شیراز فارسیوں کے کلچر کا مرکز ہے

(ب) آپ کے خطوں سے مجھے نہایت . . . . . .

(ج) البتہ کتاب خریدنے میں . . . . . .

۶۔ نیچے کے جملوں کو صاف صاف خوشخط اپنی کاپی میں نقل کرو ۔

(الف) شیراز فارسیوں کے کلچر کا مرکز تھا ۔

(ب) زبانیں اپنی اندرونی قوتوں سے نشو ونما پاتی ہیں ۔

(ج) ایرانی شاعری کا قاآنی پر خاتمہ ہو گیا ۔

۲۰۔ اقبال کے لطائف

اقبال کی طبیعت میں مزاح اور خوش طبعی بڑی فراوانی سے پائی جاتی تھی۔ کسی قسم کا موضوع ہو وہ ہنسنے ہنسانے کا پہلو نکال لیا کرتے تھے۔ یہاں ان کے چند لطیفے بیان کیے جاتے ہیں۔

(۱) میکلوڈ روڈ پر علامہ کی کوٹھی کے پیچھے دیال سنگھ کالج کا کھیل کا وسیع میدان تھا برسات کے موسم میں جب موسلا دھار بارشیں ہوتیں تو یہ میدان پانی سے بھر جاتا اور ایک اچھی خاصی جھیل کا منظر پیش کرتا، پانی جمع ہو جانے سے مچھر اور مینڈک بڑی کثرت سے پیدا ہو جاتے۔ مچھروں سے تو کسی نہ کسی طور بچاؤ کا انتظام ہو جاتا مگر مینڈک رات کو اس شدت سے ٹراتے کہ سونا حرام کر دیتے۔ بیگم اقبال زچ ہو کر کبھی کالج والوں کو بُرا بھلا کہتیں تو کبھی مینڈکوں کو کوستیں۔ ایک دفعہ حضرتِ علامہ سے بھی اس کا ذکر آیا تو آپ بہت ہنسے اور فرمایا:۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ لوگ شب بیداری کے لیے کیا کیا جتن کرتے ہیں لیکن آپ کے لیئے تو قدرت نے خود ہی انتظام کر دیا اس لیے مینڈکوں کو بُرا بھلا کہنے کے بجائے اللہ اللہ کیا کیجئے۔"[۱]

(۲)۔ حضرت علامہ جب کبھی کسی کی دعوت کرتے تو خاص اہتمام کیا جاتا۔ بیگم صاحبہ کھانے پکانے کی ماہر تھیں۔ اُن کے پکائے ہوئے کھانے ایسے لذیز ہوتے کہ مہمان چٹخارے لے لے کر کھاتے۔ ایک دفعہ کسی صاحب کی دعوت تھی۔ نواب ذوالفقار

---

[۱] اقبال درونِ خانہ ص ۴۷۔

علی خاں بھی مدعو تھے ۔ سب لوگوں نے کھانوں کی بڑی تعریف کی ۔ لیکن کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ پکائے ہوئے کس کے ہیں ۔ نہ کسی نے پوچھا نہ علامہ ہی نے بتانا مناسب سمجھا ۔ اتفاق سے چند روز بعد نواب ذوالفقار علی صاحب کے یہاں کسی تقریب کا اہتمام تھا ۔ انہوں نے علامہ کو پیغام بھیجا کہ اُس دن جس خانساماں نے آپ کے ہاں کھانا تیار کیا تھا براہِ نوازش اُس کا پتہ بتائیں ۔ آپ اس پیغام سے بڑے محفوظ ہوئے اور جواب بھجوایا :۔

"بھائی میں تو غریب آدمی ہوں کھانا وغیرہ میری بیگم خود پکاتی ہیں" پھر بیگم کو سارا واقعہ سنایا اور مسکراتے ہوئے کہا :۔

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا!"

---

۳ ۔ اقبال کو آم بہت مرغوب تھے ۔ ایک مرتبہ اکبر نے الہ آباد سے اُن کے لیے "لنگڑا آم" کی ایک پیٹی بھجوائی ۔ اقبال نے اس کی رسید میں یہ شعر لکھ بھیجا :۔

اثر یہ تیرے اعجازِ مسیحائی کا ہے اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا، لاہور تک آیا[1]

---

۴ ۔ میرے ایک قریبی رشتہ دار سید واجد علی صاحب کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا ۔ ایک دفعہ میں اُن کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر ڈاکٹر صاحب (اقبال) سے ملنے گیا ۔ موٹر میں اُن کے کتے بھی تھے ۔ ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کے پاس جا بیٹھے اور کتوں کو موٹر ہی میں چھوڑ دیا ۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر صاحب کی ننھی بچی منیرہ بھاگی ہوئی آئی اور کہنے لگی :۔

"ابا جان موٹر میں کتے آئے ہیں"

ڈاکٹر صاحب نے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا :۔

---

[1] ۔ روزگارِ فقیر حصہ اول صہ ۵۱ ۔

"نہیں بیٹا! یہ تو آدمی ہیں"

۵۔ نادر خاں (جو بعد میں والیِ افغانستان ہوئے اور نادر شاہ کہلائے) سے جب پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تو وہ کابل جاتے ہوئے لاہور میں ٹھہر گئے تھے۔ علامہ فرماتے ہیں وہ میری صورت دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے "آپ اقبال ہیں؟ میں سمجھتا تھا لمبی ڈاڑھی والے بزرگ ہوں گے" میں نے کہا:۔

"آپ سے زیادہ مجھے حیرانی ہوئی۔ آپ تو جرنیل ہیں۔ میں سمجھتا تھا آپ دیوہیکل ہوں گے۔ مگر آپ میں جرنیلی کی کوئی شان نہیں۔ اس قدر دُبلے پتلے!"

۶۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ایم اے پی ایچ ڈی فرماتے ہیں:۔

"ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں بڑا مزاح تھا۔ فرماتے تھے ایک دفعہ ایک فقیر ہاتھ میں ڈنڈا لیے، تہمد باندھے آگیا۔ میں کرسی پہ بیٹھا تھا میری ٹانگیں دبانے لگا۔ میں مزے سے بیٹھا رہا اور وہ میرے پاؤں دباتا رہا۔ آخر میں نے پوچھا، "آپ کیسے آئے ہیں؟ اس فقیر نے کہا، میں فلاں پیر صاحب کی خدمت میں حاضر تھا انہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے علاقے کا قلندر ڈاکٹر اقبال کو مقرر کر دیا گیا ہے۔ تم اُن کے پاس جاؤ" میں نے اس سے کہا کہ، مجھے تو ابھی تک اس تقرر کی کوئی اطلاع نہیں ملی"۔ میری اس بات کو بھی اُس فقیر نے قلندری کے کوچے کی کوئی رمز سمجھا۔ ٹانگیں دباتا رہا۔ اتنے میں چودھری محمد حسین صاحب تشریف لے آئے اور آتے ہی سکندر کے بارے میں گفتگو شروع کرنے ہی والے تھے کہ میں نے ٹوکا اور کہا چودھری صاحب! اس سکندری کو رہنے دیجیے آج یہاں قلندری کی باتیں ہو رہی ہیں" [1]

---

[1] ۔ ملفوظات اقبال۔

الفاظ کے معنی

لفظ	معنی
مِزاح	مذاق
خوش طبعی	دل لگی، مذاق
منظر	تماشا، تماشاگاہ، نگاہ پڑنے کی جگہ
نیند حرام کر دیتے	نیند بے مزہ کر دیتے، سونے نہیں دیتے۔
زِچ ہو کر	تنگ آکر
شب بیداری۔	رات کو جاگنا
جتن۔	تدبیر
تقریب۔	شادی بیاہ وغیرہ سبب، موقع۔
محظوظ	خوش
غائبانہ	پیٹھ پیچھے
مرغوب	پسندیدہ
اعجاز مسیحائی	عیسیٰ علیہ السلام کا سا معجزہ۔
معذور	جس کو کسی بات میں عذر ہو، مجبور ہو

لفظ	معنی
موضوع	مضمون، مدعا
لطیفہ	چٹکلا، دلچسپ بات
والیٔ افغانستان۔	افغانستان کا بادشاہ
رمز	بھید
۔ کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا!	تجھ کو دنیا پیٹھ پیچھے کیا کہتی ہے
لنگڑا آم	لنگڑا کے دو معنی ہیں۔ (۱) ایک ٹانگ سے معذور (۲) ایک قسم کا مشہور آم جو نہایت لذیذ ہوتا ہے۔ شعر میں دونوں معنوں سے کام لیا ہے اور اسی بات سے شعر میں لطف پیدا ہوا ہے (۱) لنگڑا آم جو آپ نے بھیجا مل گیا۔ اور (۲) لنگڑا الٰہ آباد سے چل کر لاہور پہنچ گیا یہ آپ کا اعجازِ مسیحائی (معجزہ) ہے ورنہ لنگڑا تو بیچارہ دو چار قدم بھی مشکل سے چل سکتا ہے۔

مشق

۱۔ اکبرالہ آبادی مرحوم نے جب اقبال کو "لنگڑا آم" بھیجا تو اُنہوں نے اس کے جواب میں جو شعر لکھ کر بھیجا تھا اُس کو پڑھ کر اس کی خوبی بیان کرو۔

۲۔ نادرشاہ اور اقبال کے درمیان جو پُرلطف گفتگو ہوئی تھی اُس کو اُسی انداز میں بیان کرو۔

۳۔ نیچے کے جملوں میں خالی جگہ کو پُر کرو:۔

(الف) لیکن آپ کے لیے تو قدرت نے . . . . . انتظام کر دیا تھا۔

(ب) بھائی میں تو غریب آدمی ہوں . . . . . کھانا وغیرہ . . . . . پکاتی ہیں

(ج) مگر آپ میں جرنیلی کی . . . . . نہیں

۴۔ ان الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔

مزاح ۔ منظر ۔ جتن ۔ مخطوظ ۔ رمز

۲۱۔ اقبال کے چند مخصوص اشعار

اقبال کے کئی اشعار لوگوں کو زبانی یاد ہوتے ہیں اور گفتگو اور تقریر کے دوران میں بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں۔ ایسے کچھ اشعار تم بھی یاد کر لو۔

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں محوِ حیرت ہوں، کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے مسلمان کو ہے ننگ ، وہ بادشاہی

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی اِمامت کا

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے، ہیرے کا جگر مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان ، نئی آن ! گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان!
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو ، وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں، وہ طوفان!

سلسلۂ درسیاتِ اقبال

سوم

فہرست مضامین (حصۂ نثر)

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	اقبال کی نثر نگاری	۳
	انتخابِ نثر	
۱	جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ	۱۲
۲	اقبال کی ایک تقریر، کابل میں۔	۱۸
۳	اقتباس از قومی زندگی	۲۲
۴	اقتباس "از ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر"	۳۱
۵	محفلِ میلاد النبیؐ	۳۸
	مکاتیبِ اقبال	۴۲
۱	مولانا گرامی کے نام	۴۵
۲	منشی سراج الدین کے نام	۴۶
۳	سراج الدین پال کے نام	۴۷
۴	علّامہ سلیمان ندوی کے نام	۴۸
۵	مولانا ظفر احمد صدیقی کے نام	۵۰
۶	مخدوم الملک سیّد غلام میراں شاہ کے نام	۵۱
۷	علّامہ مصطفیٰ المراغی کے نام	۵۲
۸	غازی عبدالرحمٰن کے نام	۵۳
۹	لمعہ صاحب کے نام	۵۴
۱۰	حافظ محمد فضل الرحمٰن انصاری کے نام	۵۵
۱۱	محمّد علی جناح کے نام	۵۶
۱۲	لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کے نام	۶۱
۱۳	قاضی نذیر احمد کے نام۔	۶۲

حصّہ نثر

اقبال کی نثر نگاری

اُردو میں علمی زبان کا مسئلہ خاصا پریشان کُن رہا ہے۔ لیکن اقبال کے مضامین کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو اگر اپنے مضمون پر واقعی قدرت ہو تو وہ اپنے لیے ایک باوقار[1] علمی زبان خود وجود میں لاسکتا ہے۔ ہمارے یہاں بہانہ ساز لوگ علمی اصطلاحات کی مشکل کا سوال اُٹھاتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ کہ علمی اصطلاحیں ہر زبان میں مشکل ہوتی ہیں، یہ لکھنے والے پر بھی موقوف[2] ہے کہ وہ علمی بات کو وضاحت کے ساتھ کس طرح ادا کرتا ہے۔ (مثلاً اقبال کے مضمون) بچوں کی تعلیم و تربیت ہی کو دیکھ لیجیے اس میں بچوں کی نفسیات، اُن کی ترغیبات[3] ذہن، اُن کے ماحول کے محرکات[4] وغیرہ کا علمی بیان ہے۔ لیکن توضیح اس قدر قابلِ فہم اور زبان باوقار ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی سادہ ہے کہ اُردو زبان سے نابلد[5] آدمی بھی تھوڑی سی کوشش سے اس کو سمجھ سکتا ہے ..... ان عبارتوں میں وہی سلاست اور مدرسانہ[6] تشریحی انداز بھی ہے اور ادیبانہ طرزِ تخاطب ہے مثلاً

> بچوں میں بڑوں کی نقل کرنے کا مادہ خصوصیت سے زیادہ ہوتا ہے۔ ماں ہنستی ہے تو خود بھی بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ باپ کوئی لفظ بولے تو اُس آواز کی نقل اتارے بغیر نہیں رہتا۔ ذرا بڑا ہوتا ہے اور کچھ باتیں بھی سیکھ جاتا ہے تو اپنے ہمجولیوں سے کہتا ہے آؤ بھئی ہم مولوی بنتے ہیں، تم شاگرد بنو۔ کہیں بازار کے دوکانداروں کی طرح سودا سلف بیچتا ہے، کبھی

---

[1] شاندار [2] منحصر [3] خواہشات، میلانات، [4] حرکت میں لانے والی باتیں [5] ناواقف [6] استادوں جیسا۔

پھر پھر اکر اُونچی آواز دیتا ہے کہ چلو، آؤ، انار سستے لگا دیئے۔

اس عبارت میں نقالی کی توضیح بھی ہے اور تصویر بھی۔ اور یہی مصوّری کا عمل، لکھنے والے کے متعلق یہ باور[1] کراتا ہے کہ وہ ادیب کا مزاج لے کر آیا ہے یہ اور بات ہے کہ فارسی ادب کے زیرِ اثر رنگینیٔ استعارہ کے شوق میں وہ رگِ چراغ اور خونِ آفتاب، شرارِ سنگ اور جلوۂ طور کے تلازمات[2] میں بھی دلچسپی لیتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اُن کے علمی مضامین میں مشکل الفاظ بھی ہیں۔ مگر اُن سے چارہ نہیں کسی عام علمی مضمون کے سلسلے میں یہ توقع رکھنا بالکل بے جا ہے کہ لکھنے والا اقلیدس اور حکمتِ عالیہ کے مسائل کو باغ و بہار اور طلسم ہوشربا کی داستان میں لکھے۔ ہر تحریر موضوع کے لحاظ سے ایک خاص "حجم"[3] اور خاص وزن" رکھتی ہے۔ علمی تحریریں اگر "خفیف" ہوں یعنی اُس وزن سے خالی ہوں جو علمی موضوع کی جزالت[4] کے لیے ضروری ہے تو ان میں علمی شان پیدا نہیں ہو سکتی . . . . علمیت کو سادہ لفظوں میں تحلیل[5] کر دینا بڑا نازک بلکہ، خطرناک کھیل ہے۔ اس میں ہر وقت یہ ڈر رہتا ہے کہ سادگی سے علمی تحریر بے وزن" نہ ہو جائے . . . . . ہماری نثر میں ایسی وزن دار اور سنجیدہ تحریروں کا اول نمونہ شبلی کے ہاں پایا جاتا ہے اور دوسرا اقبال کے یہاں۔

شبلی کی فلسفیانہ نثر اور اقبال کی حکیمانہ نثر میں یہ فرق ہے کہ شبلی کی تحریروں کا جھکاؤ کسی حد تک سرسید احمد خاں کے دبستانِ نثر کے خصوصیات کی طرف ہے۔ یعنی وہ عبارتوں کی علمی شان کو قائم رکھتے ہوئے بھی یہ دیکھتے ہیں کہ محاورے کی بے تکلفی قائم رہے۔ اقبال محاورے کی بے تکلفی کو ضروری نہیں سمجھتے۔ علمی عبارت کی علمی فضا کا خیال رکھتے

---

[1] یقین دلاتا ہے۔ [2] مضمون کی رعایت سے الفاظ کا استعمال تلازمہ کہلاتا ہے۔ تلازمات جمع ہے۔ [3] جسامت۔

[4] بڑائی خوبی مضبوطی۔

[5] حل کر دینا۔

ہیں . . . . دونوں میں فرق یہ ہے کہ اگر شبلیؔ نے حکیمانہ نثر کی آن قائم رکھی تو اقبال نے حکیمانہ نثر کا وزن بڑھایا۔ اور اس کا رُتبہ اُونچا کیا . . . . اُن کا خیال یہ تھا کہ اُردو زبان خصوصاً علمی زبان کو وزن دار اور رُعب دار ضرور ہونا چاہیئے۔ اور اُن کی علمی زبان ہی اس کا معیار ہے۔ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں تینوں سہل لکھنے پر قادر تھے۔ لیکن وہ اپنی زبان کو اُس تہذیب کا ترجمان اور نشان بنانا چاہتے تھے۔ جو برگستوان[1] اور قہستان کا دبدبہ رکھتی ہو۔ یہ مقامی اور زمینی رنگ اور عورتوں کی بولی اس قہستانی تہذیب کے حسبِ حال نہیں ہوسکتی۔ یہ معلوم ہے کہ علّامہ نے کہستان کو قہستان لکھ کر اپنے لہجے اور ذوق کی خارا پسندی[2] کا ثبوت دیا ہے۔ بعض لوگ اس کو روزمرّہ کی مخالفت کہیں گے بعض دوسرے اس کو مشکل پسندی قرار دیں گے۔ لیکن ظاہر ہے قلعۂ احمد نگر کا معمار قیصر باغ کا معمار نہیں ہوسکتا۔

لیکن ہمارے یہاں علمی تحریر کی شان بہت کم لوگ برقرار رکھ سکے ہیں . . . . بہرحال اُردو نثر میں علامہ نے اگرچہ کم لکھا لیکن وہ علمی اسلوب کا ایک منفرد[3] رنگ اُردو نثر کو دے گئے ہیں۔ جو اُن کے پیغام اور ان کی مرغوب تہذیب دونوں کا ترجمان ہے۔

میری تحریر سے یہ غلط فہمی نہیں ہوگی کہ علّامہ کی تحریر خشک اور محض سنجیدہ تھی . . . . . اُن کی اُردو نثر کا علمی حصّہ بھی خشک نہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ ان کی مشکل سے مشکل تحریر کو پڑھ کر بھی ثقل[4] کا احساس نہیں ہوتا۔ البتہ وہ وزن ہر جگہ موجود ہے جو اُن کی تحریر کو خفیف ہونے سے بچاتا ہے یہ یاد رہے کہ اقبال کی تحریریں بے رنگ نہیں۔ آخر وہ ایک شاعر کی تحریریں ہیں۔ ان میں تخیل اور جذبہ آفریں لفظوں کی کارفرمائی تو مسلم امر ہے . . . . . .

میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ اقبال اگر شاعری نہ کرتے اور نثر ہی لکھتے تو بھی وہ

---

[1] ۔ لحاف کی ایک قسم جس کو بغرض زینت و حفاظت گھوڑے پر ڈالتے ہیں۔
[2] مشکل پسندی [3] یکتا بتاز [4] بھاری پن۔

اُردو نثر میں مرزا غالبؔ کے مانند ایک خاص دبستان[1] یادگار چھوڑ جاتے وہ اپنی خاص شگفتہ تحریر کے زیادہ سے زیادہ نمونے ہمیں دے جاتے اور ایک ایسا ادبی انداز ایجاد کرتے جس میں زبردست قوتِ فکریہ کے ہمراہ ایک قوی قوتِ متخیلہ دست بدست مل رہی ہوتی جس میں شاعری نثر سے ہم آغوش نظر آتی

- (شفاراز جسارت ڈاکٹر سید عبداللہ بہ مقالاتِ اقبال)

"اقبال کے مضامین پیچیدہ مسائل کی عام تشریح کے لحاظ سے معیاری نمونہ قائم کرتے ہیں اور پیچیدہ مسائل پر فکر و تدبر اور اظہار خیالات کی راہیں بتاتے ہیں۔ خیالات کی عظمت کے باوجود زبان کی شستگی اور روانی ان کے مضامین کی خصوصیت ہے . . . . جیسا کہ ان کی ہمہ گیر طبیعت کا تقاضا تھا اُردو زبان کی خدمت پر آمادہ ہونے سے پہلے علامہ نے علم اللسان کا گہرا مطالعہ کر لیا تھا وہ زبان کے نشو و نما[2] کے قانون سے بخوبی واقف تھے چنانچہ اپنے خط میں سردار عبدالرب نشترؔ کو لکھتے ہیں :-

"زبان کو میں بُت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو وہ مُردہ ہو جاتی ہے۔ ہاں تراکیب کے وضع کرنے میں مذاقِ سلیم کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔"

اس سلسلے میں ایک دفعہ مولوی عبدالحق مرحوم کو لکھا تھا۔

"زبانیں اپنی اندرونی قوتوں سے نشو و نما پاتی ہیں۔ اور نئے نئے خیالات و جذبات کے ادا کرنے پر ان کی بقا کا انحصار ہے" . . . . اقبال کی اُردو نثر پر سچ پوچھئے تو اُردو نثر کا اقبال ہے۔ مضامین اقبال اُردو ادب کے عظیم الشان انقلابی مظاہر ہیں[3]، ترقی پسند ادب کا معیار ہیں، دلیل راہ ہیں، ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کا سنگِ بنیاد ہیں یہ مضامین ہمیں احتسابِ[4] کائنات کے حکیمانہ طریقے سمجھاتے ہیں۔ انسانی

---

[1] مکتب سکول [2] بڑھنا، ترقی کرنا۔ [3] تماشا گاہیں [4] جائزہ لینا

مسائل پر فکر و تدبّر کے سلیقے سے آشنا کرتے ہیں ۔"

(پیش لفظ سیّد عبدالواحد بہ مقالات اقبال)

"اقبال نے ہمارے حکما، شعرا اور اُدبا میں سب سے پہلے، ہر مذموم[1] کو محمود بنانے والے "آرٹ برائے آرٹ" اور ادب برائے ادب" کے نظریے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، اس تصوّر کو حکیمانہ دلائل اور عمرانی[2] تجربات سے مدلّل کیا۔" آرٹ برائے آرٹ" کے اصول میں اقبال کے نزدیک حسن کا ایک تصوّر رہ جاتا ہے جس میں صداقت اُس کے لازمی جزو کے طور پر باقی نہیں رہتی۔ ایسے آرٹ اور ادب سے خستہ جان قوموں کی خستہ جانی اور ناتواں ملتوں کی ناتوانی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اس لیے معیار ادب اقبال کے نزدیک اس کی حیات بخشی کی صلاحیت ہے۔ اور ادب اور آرٹ حیات انسانی کے تابع[3] ہیں۔ اقبال ادب میں فکر صالح[4] کے طالب ہیں تاکہ آرٹ اور ادب پیکار حیات سے میل کھا سکیں۔ اور قومی تعمیر کے امتحانات میں دل فریبی کی شان پیدا کریں۔ وسواس[5] اور ہراس[6] کو دل سے دور کریں۔ کوہِ گراں کو کاہ بنائیں۔ چنانچہ اقبال کے دو مضامین ایک "جناب رسالتمآب[7] کا ادبی تبصرہ" دوسرا "دیباچہ مرقع چغتائی"، اسی بحث پر مشتمل[8] ہیں۔ اقبال نے ان مقالات میں دکھایا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے وجدان نے کس طرح اس باب میں انسانی فکر و ادب کی رہنمائی فرمائی ہے۔

اشتراکی اور ترقی پسند ادیب بھی اس نکتے میں اقبال کے ہم نوا بن[9] گئے ہیں اور بڑے زور سے اقبال کی طرح "ادب برائے زندگی" کا پرچار کیا جا رہا ہے مگر دونوں کا فرق خود زندگی کی بابت ان کے تصوّرات میں ملتا ہے "اشتراکی" زندگی کو صرف مادّی پیمانہ امروز و فردا سے ناپتے ہیں اور دانائے راز اقبال کا تصوّرِ حیات وسیع تر اور عمیق تر[9] ہے۔ اُن کی نگاہ اور عقیدے میں زندگی کے تسلسل، توسیع اور استحکام کے امکانات

---

[1] ناپسندیدہ۔ [2] تمدنی۔ تہذیبی۔ [3] ماتحت [4] صحت مند فکر [5] بُرا خیال
[6] خوف [7] بارے میں [8] ہم آواز [9] گہرا۔

اور لوازم کا دائرہ حد بندی سے بالاتر ہے ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

مضامینِ نثر میں اقبال کے بعض مبہم[1] اور مشکل تصوّرات معین اور واضح ہو جاتے ہیں۔ بعض مجمل نکات مفصل توجیہات[2] کے آئینے میں اُجاگر ہوتے ہیں۔ اقبال نے اپنے مضامین میں باطل اقدار کی جگہ ترقی پرور اقدار پیش کی ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ذہنِ انسانی کو دگرگوں کر دیں تاکہ وہ جہان دیگر پیدا کر سکے۔ ان کے افکار سے بحر و بر میں انقلاب کا طوفان برپا کیا جا سکتا ہے۔

"اقبال ادب و فلسفہ کے علاوہ عمرانیات کے نہایت بالغ[3] نظر عالم اور ماہر تھے۔ قوموں کے عروج و زوال کے اصول اور قوانین پر اُن کی نظر دور رس ہے۔ حکمتِ ایمانی اور مصلحتِ عمرانی کا مطالعہ ایک دوسرے سے تعلق کی روشنی میں خوب کیا ہے۔ ان کے اکثر مضامین کا موضوعِ بحث یہی ایمانی حقیقتیں اور عمرانی حکمتیں ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں ان کے مضامین کی غایت بھی،

"اُن اخلاقی، مذہبی، ملّی حقائق کو پیشِ نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے تاکہ افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید[4] ہو۔

"اقبال چاہتے ہیں۔ نبوّت محمدیؐ کی تعلیم کے مطابق بنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب[5] و قبائل اور الوان[6] و السنہ[7] کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، ان کو ان تمام آلودگیوں[8] سے پاک کیا جائے جو زبان و مکان، وطن، قوم، نسل، نسب ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں۔ اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی[9]

---

[1] اُلجھے ہوئے [2] تشریحات۔ دلائل [3] ذہین، حقیقت کو جاننے والا [4] پیدائش
[5] قبیلے [6] لون کی جمع رنگ [7] لسان کی جمع زبانیں۔ [8] نجاستوں۔
[9] فرشتوں جیسی۔

تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر دور میں ابدیت[۱] سے ہم کنار رہتا ہے ۔ یہ ہے مقام محمدیؐ ، یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ"

(مقدمہ مضامین اقبال مرتبہ تاج)

" بعض لوگ کہتے ہیں کہ اقبال کی ، اسلام کے ساتھ گرویدگی[۲] ، گروہ بندی یا فرقہ بندی کے مذاق پر مبنی ہے ۔ حالانکہ صورت حال برعکس ہے ۔ اور یہ خیال لاعلمی یا نارسائی فکر کے باعث ہے ۔ اس کا سبب خود اقبال سے سنیئے :۔

" اگر عالمِ بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن ، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظامِ اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا"[۳]

اقبال مشترک (Goman) مفادات میں بیجا تعصب کے ہرگز حامی نہیں ، وہ تعاون[۴] کے داعی ہیں ، قرآنی تعلیم کی دعوت بھی یہی ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

" سب سے زیادہ اہم عقدہ اُس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے ، یہ ہے کہ کیونکر اپنی قوم کی اقتصادی حالت کو بہتر بنائے ۔ اس کا یہ فرض ہے کہ کسی اور مسئلے پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ ملک کی اس حالت میں کس حد تک اُن بڑی اقتصادی[۵] قوتوں نے حصہ لیا ہے جو آج کل کی دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں ۔ جو شخص اس گتھی کو سلجھانے کا بیڑا اُٹھائے ، اُسے چاہیئے کہ مذہب و ملت کے اختلاف کی طرف سے خالی الذہن ہو جائے اور کسی ایک جماعت کی طرفداری یا پاسداری کے خیال کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے ۔ اس لیے کہ اقتصادی قوتیں تمام قوموں پر اپنا عمل یکساں کرتی ہیں

(مقدمہ " مضامین اقبال " مرتبہ تاج)

---

[۱] ہمیشگی   [۲] عشق و محبت   [۳] باہم مدد کرنا
[۴] ۔ مالی ۔

اسلوبِ بیان :-

"مضامین اقبال اُن بیش بہا تخیّلات کے علاوہ ، جن کا ذکر ہوا ، ہماری زبان کو غیر معمولی حکیمانہ اور عالمانہ اسالیبِ بیان کی دولت بخشتے ہیں . انگریزی اور جرمن زبانوں میں فلسفیانہ کتابیں پڑھئے . عمرانی علوم کے مضامین کا مطالعہ فرمائیے ، بڑے بڑے ایجاد کار حکمار ، اور علمار کے اسالیبِ بیان کا اندازہ کیجیے ، اسالیبِ اقبال انہی کے آثار ہیں جدید علوم وفنون پر جو لوگ اُردو میں لکھ رہے ہیں اُن کے لیے اقبال کے مضامین ہمیشہ نمونے ہیں . کسی قدر عمیق اور دقیق . اُردو میں یہ طرزِ تحریر منفرد یعنی آپ اپنی مثال ہے نہایت پختہ اور پُرشوکت ادبی چٹخاروں اور شوخیوں سے خالی . لیکن کئی ترکیبیں نہایت بلیغ اور نئی ہیں . یہ اقبال کی ایجاد اور عطیہ ہیں . طرزِ اظہار سلیس ، رواں نہیں ، سنجیدہ اور گراں ہے . انگریزی کی علمی تحریروں کی طرح جابجا جملے ، ترکیب در ترکیب کے حامل . مطالعہ کئی مقامات پر تکرار کا طالب ہوتا ہے .

اقبال کا عام مشغلہ مضمون نویسی یا مقالہ نگاری ہرگز نہ تھا . ابتدار میں جب اُن پر اعتراضات کے بم " ضائع پرستوں " کی طرف سے برس رہے تھے تو ان کی طبیعت تحقیق ، کی طرف مائل ہوگئی . لیکن ایک بلند نظر انسان کی طرح ان کو اعتراف تھا کہ :-

" آپ مطمئن رہیں مجھے اساتذہ کی ہم سری کا دعویٰ نہیں . اگر اہلِ پنجاب مجھے . . . . بہمہ وجوہ کامل خیال کرتے ہیں تو اُن کی غلطی ہے . زبان کا مسئلہ بڑا نازک ہوتا ہے . یہ ایک ایسی دشوار گزار وادی ہے بالخصوص اُن لوگوں کو جو اہلِ زبان نہیں ہیں ، یہاں قدم قدم پر ٹھوکر لگنے کا اندیشہ ہے .

(مقدمہ " مضامین اقبال " مرتبہ تاج)

خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے کہ اقبال نے ایک ایسی باوقار ، علمی زبان پیدا کی ہے جو اپنا جواب نہیں رکھتی . انہوں نے مشکل علمی اصطلاحات سے بھی کام لیا ہے مگر اُن کو ایسی وضاحت کے ساتھ ادا کیا ہے کہ وہ قابلِ فہم ہوگئی ہیں . پھر ان کی زبان باوقار

ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی سادہ ہے کہ اُردو زبان سے ناواقف آدمی بھی تھوڑی سی کوشش سے اس کو سمجھ سکتا ہے۔

اقبال کا خیال یہ تھا کہ علمی زبان کو وزن دار اور رُعب دار ہونا چاہیے۔ چنانچہ خود ان کی علمی زبان اس کا بہترین نمونہ ہے۔ متعدد اشخاص کو جو انہوں نے اپنے خطوط میں اُردو زبان کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ زبان کے نشوونما اور ترقی کے اُصول وضوابط سے پوری پوری واقفیت رکھتے تھے۔ اسی لیے اقبال کی اُردو نثر ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کا سنگِ بنیاد ہے۔ اقبال کے مضامین ہمیں احتسابِ کائنات کے حکیمانہ طریقے سمجھاتے ہیں اور انسانی مسائل پر فکر و تدبر کے سلیقے سے آشنا کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا بیش بہا خیالات کے علاوہ مضامینِ اقبال نے ہماری زبان کو غیر معمولی حکیمانہ اور عالمانہ اسالیبِ بیان کی دولت بھی بخشی ہے۔ انگریزی اور جرمن زبانوں میں فلسفیانہ کتابیں پڑھئے عمرانی علوم کے مضامین کا مطالعہ فرمائیے، بڑے بڑے ایجاد کار حکما اور علما کے اسالیبِ بیان کا اندازہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسالیبِ اقبال انہی کے آثار ہیں۔ نہایت پختہ اور پُرشوکت ادبی چٹخاروں اور شوخیوں سے خالی۔ مگر کتنی ہی ترکیبیں نہایت بلیغ اور نئی ہیں، طرزِ اظہار سلیس و رواں نہیں، سنجیدہ اور گراں ہے اور انگریزی کی علمی تحریروں کی طرح جابجا جملے، ترکیب در ترکیب کے حامل۔ مطالعہ کئی مقامات پر تکرار کا طالب ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود دلچسپی و دل کشی سے خالی نہیں۔

بہرحال اُردو نثر میں اقبال نے اگرچہ کم لکھا ہے، مگر وہ علمی زبان اور حکیمانہ اسلوبِ نگارش کا ایک ایسا منفرد رنگ اُردو نثر کو دے گئے ہیں جو ان کے پیغام اور مرغوب تہذیب دونوں کا ترجمان ہے۔

انتخابِ نثر

۱۔ جنابِ رسالت مآبؐ کا ادبی تبصرہ

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے عہد کی عربی شاعری کی نسبت وقتاً فوقتاً جن ناقدانہ[۱] خیالات کا اظہار فرمایا ہے اُن کی روشنی صفحاتِ تاریخ کے لیے خطِ پاشان[۲] کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن دو موقعوں پر جو تنقیدات آپؐ نے ارشاد فرمائیں ان سے مسلمانانِ ہند کو آج کل کے زمانے میں بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے کہ ان کا ادب اُن کے قومی انحطاط کے دور کا نتیجہ ہے۔ اور آج کل انہیں ایک نئے ادبی نصب العین[۳] کی تلاش ہے۔ شاعری کیسی ہونی چاہیئے اور کیسی نہ ہونی چاہیئے، یہ وہ عُقدہ ہے، جسے جنابِ رسالتمآبؐ کے وجدان نے اس طرح حل کیا ہے۔

اِمراءُ القیس نے اسلام سے ۴۰ سال پہلے کا زمانہ پایا ہے۔ روایت ہمیں، بتاتی ہیں کہ جناب پیغمبرؐ نے اس کی نسبت ایک موقعے پر حسب ذیل رائے ظاہر فرمائی۔ "اَشعَرُ الشعراءُ وقائدھُم اِلیٰ النّار" یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے ہی لیکن جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِمرا القیس کی شاعری میں وہ کون سی باتیں ہیں جنھوں نے حضور سرورِ کائناتؐ سے یہ رائے ظاہر کروائی۔ اِمرا القیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شرابِ ارغوانی کے دَوَر، عشق و حُسن کی ہوش رُبا داستانوں

۱۔ تنقیدی

۲۔ پاشان کے معنی متفرق اور دُور دُور کے ہیں۔ اس تحریر کو خطِ پاشان کہتے ہیں جس میں دائرے اور حروف دُور دُور لکھے ہوں مُراد ہے نمایاں منفرد

۳۔ مقصد

اور جان گداز جذبوں ، آندھیوں سے اُڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں، سنسان ، ریتلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہی عرب کے دورِ جاہلیت[۱] کی کُل تخیّلی کائنات ہے ۔ امراء القیس قوتِ ارادی کو جنبش میں لانے کے بجائے اپنے سامعین کے تخیّل پر جادُو کے ڈورے ڈالتا ہے اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کرتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنونِ[۲] لطیفہ کے اس اہم اُصول کی توضیح فرمائی ہے کہ ضائع و بدائع[۳] کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن[۴] یہ کچھ ضروری نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ہوں ۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علّیین[۵] کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافلین[۶] کا تماشا دِکھا دے شاعری دراصل ساحری ہے اور اُس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کے مشکلات و امتحانات میں دل فریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے فرسودگی و انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھا دے اور اس طور پر اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے ۔ اس کا فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوّت کا جو حصّہ اسے دکھایا گیا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرے نہ یہ کہ اُٹھائی گیر بن کر جو رہی سہی پُونجی ان کے پاس ہے اُس کو بھی ہتھیا لے ،،

ایک دفعہ قبیلۂ بنوعبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو سنایا گیا ۔

ولقَدْ اَبِیتُ علی الطوی واظلہ   حتّیٰ اُنالُ بہ کریمُ المأکل

---

[۱] اسلام سے پہلے کا زمانہ [۲] شاعری مصوری اور موسیقی وغیرہ [۳] اشعار میں جو لفظی اور معنوی خوبیاں ہوتی ہیں ان کو صنائع و بدائع کہتے ہیں [۴] خوبیاں جمع حُسن، کی [۵] علیین علیہ کی جمع ہے جنت کے اونچے اونچے مکان ۔ [۶] دوزخ کا سب سے نچلا ساتواں حصہ ، حاویہ ۔

(ترجمہ) میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں تاکہ میں آکل حلال کے قابل ہو سکوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت[1] کا مقصدِ وحید[2] یہ تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائیں اور اُس کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آیند اور مطبوع کر کے دکھائیں اس شعر کو سُن کر بے انتہا محظوظ ہوئے۔ اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اُس کا شوقِ ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندہ[3] کے دیکھنے کو میرا دل، بے اختیار چاہتا ہے۔

اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزندِ اعظم، صلی اللہ علیہ وسلم، جس کے چہرہ مُبارک پر ایک نظر ڈال لینا نظارگیوں[4] کے لیے دینوی برکت اور اُخروی[5] نجات کی دوکونہ سرمایہ، اندوزی کا ذریعہ تھا خود ایک بُت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے کہ اس عرب نے اپنے شعر میں اُس کی گوں کی بات کہی تھی۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عزت عنترہ کو بخشی اُس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر ہے۔ حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اُٹھانی پڑتی ہیں، جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں اُن کا نقش پردۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ حضور خواجۂ دوجہاںؐ (بابی وانت وامّی) نے جو اس قدر شعر کی تعریف فرمائی ہے اس سے صنعت کے ایک دوسرے بڑے اُصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیاتِ انسانی کے تابع ہے، اُس پر فوقیت نہیں رکھتی۔

ہر وہ استعداد جو مبدءِ[6] فیاض نے فطرتِ انسانی میں ودیعت[7] کی ہے اور ہر وہ

---

[1] رسالتِ پیغمبر کا بھیجا جانا [2] واحد۔ یکتا۔ [3] لکھنے والا۔ [4] نظارگی، دیکھنے والا۔
[5] آخرت کی۔ [6] اللہ تعالیٰ۔ [7] رکھی ہے۔

توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی ہے ایک مقصدِ[1] وحید اور ایک غایت[2] الغایات کے لیے وقف ہے۔ یعنی قومی زندگی، جو آفتاب بن کر چمکے، قوت سے لبریز ہو، جوش سے سرشار ہو۔ ہر انسانی صنعت، اس غایت آفریں کے تابع اور مطیع ہونی چاہیئے اور ہر شے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیئے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے۔ تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش موجود ہیں (کہ انکیں پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں، انحطاط اور موت کا پیغام ہے۔ صنعت گر کو چغتائی بیگم کے حلقۂ عشاق میں داخل نہ ہونا چاہیئے۔ مصوّرِ فطرت کو اپنی رنگا رنگ نگارآرائیوں کا اعجاز دکھانے کے لیے افیون کی چسکی سے احتراز واجب ہے۔ یہ پیش پا افتادہ[3] فقرہ جس سے ہمارے کالجوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمالِ صنعت اپنی غایت آپ ہے، انفرادی و اجتماعی انحطاط کے لیے ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اس لیے تراشا گیا ہے کہ تم سے زندگی اور قوت دھوکا دے کر چھین لی جائے۔ غرض یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجدانِ حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا اُس نے اصل الاُصول[4] کی بنیاد ڈالدی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح ارتقار کیا ہونی چاہیئے۔"

مضمون محوّلہ بالا، "ستارہ صبح لاہور" میں ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اقبال کی "بامقصد، اسلامی شاعری" کا آغاز ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے اقبال کے یہ خیالات نگارشِ مضمون کے وقت یکایک پیدا نہیں ہو گئے تھے اور نہ مضمون لکھنے کے بعد ختم ہو گئے۔ بلکہ یہ خیالات بہت پہلے پیدا ہو کر اس مضمون کے لکھنے کے وقت تک پختہ اور مستحکم ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پھر آخر عمر تک ان کی شاعری و انشاپردازی اُسی معیار کی رہنمائی میں ترقی کرتی رہی، جو حضورؐ کے ادبی تبصرے نے قائم کیا تھا۔

---

[1] واحد مقصد، تنہا مقصد۔ [2] تمام مقصدوں کا مقصد۔ اصل مقصد۔ [3] معمولی سامنے کی چیز [4] حقیقی اور بنیادی اُصول۔

اس مضمون سے اقبال کی شاعری اور انشار پردازی کے سمجھنے میں آسانی پیدا ہوئی اور معلوم ہوگیا کہ اُنہوں نے اپنی نگارشات کا خود کوئی معیار و مقصد متعین نہیں کیا بلکہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادبی تبصرے کی روشنی میں جادۂ سخن گوئی پر گامزن رہے کیونکہ حضورؐ کا تبصرہ قرآن کی اُس سورت کے آخری جملوں کی ترجمانی ہے جس کا عنوان ہے "الشعراء" جس میں خود خالقِ عالم نے شاعری کی دو قسمیں کر دی ہیں۔ ایک وہ جو لوگوں کو گمراہ کرتی ہے اور دوسری وہ جو اللہ پر ایمان لانے اور عملِ صالح کرنے والوں سے متعلق ہے اور جس کا مقصد مخلوقِ خدا کی ہدایت اور نوعِ انسانی کو خیر کی طرف بلانا ہے

اس مضمون میں اقبال نے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ادبی تبصرے کی روشنی میں یہ بتایا ہے کہ شاعری کیسی ہونی چاہیئے اور کیسی نہیں ہونی چاہیئے۔ یعنی جو شاعری ہوشیاری کے بجائے سامعین پر بے خودی کی کیفیت طاری کر دے اس کو مذموم قرار دیا ہے امرار القیس کے کمالات شاعری سے کس کو انکار ہو سکتا ہے جب کہ خود حضور نبی کریمؐ نے اس کو "اشعر الشعراء" فرمایا ہے۔ مگر امرار القیس نے صنائع اور بدائع کے محاسن کو ہی سب کچھ سمجھا اور انسانی زندگی کے محاسن کی کوئی پروانہ کی، حالانکہ اِن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ عین ممکن ہے کہ شاعر شعر بہت اچھا کہے لیکن وہی شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیین کی سیر کرانے کے بجائے اسفل السافلین کا تماشا دکھا دے۔

اقبال فرماتے ہیں کہ شاعری اثر انگیزی کے اعتبار سے ایک قسم کی ساحری ہے اور جب یہ بات ہے تو اس کی اثر انگیزی سے صحیح کام لینا چاہیئے۔ اور وہ یہ ہے کہ قومی زندگی کے مشکلات اور امتحانات میں دل فریبی کی شان پیدا کر کے لوگوں میں مشکلات خوشی خوشی انگیز کرنے کا حوصلہ پیدا کیا جائے۔ اور قوم میں مایوسی اور پست ہمتی پیدا نہ ہونے دی جائے۔ اقبال فرماتے ہیں اِس شاعر پر افسوس ہے جو ایسا کرنے کی بجائے فرسودگی اور انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھائے اور اس طرح قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ فرماتے ہیں شاعر کا یہ فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں

سے زندگی اور قوت کا جو حصّہ اسے دکھلایا گیا ہے اس میں وہ دوسروں کو بھی شریک کرے۔ یعنی اپنے کلام کے ذریعے اسے دوسروں کو بھی دکھا دے کہ زندگی اور قوت اس کو کہتے ہیں۔

عنترہ کے شعر کو حضورؐ نے اس لیے پسند فرمایا کہ وہ ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے۔ یعنی حلال کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں ان کا نقش پردۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ صنعت، حیاتِ انسانی کے تابع ہے۔ اس پر فوقیت نہیں رکھتی لہٰذا ہر وہ استعداد جو اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی میں ودیعت کی اور ہر وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی ہے، اس کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اُس کے ذریعے قومی زندگی کو آفتاب بنا کر چمکایا جائے۔ اُسے قوت سے لبریز اور جوش سے سرشار کر دیا جائے یعنی ہر چیز کی قدر و قیمت کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے جس میں جتنی زیادہ یہ بات پائی جائے گی وہ اتنی ہی زیادہ قابل تعریف ہو گی۔ اور یہ خیال کہ کمالِ صنعت اپنی غایت آپ ہے، انفرادی و اجتماعی انحطاط کا ایک عیّارانہ حیلہ ہے جو اس لیے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکہ دے کر چھین لی جائے۔

۲۔ اقبال کی ایک تقریر کابل میں

علامہ اقبال کے سفرِ افغانستان کے موقع پر کابل میں، انجمن ادبی کابل، نے علامہ اور دوسرے اراکینِ وفد کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا۔ اس کے بعد افغانستان کے مشہور شاعر عبداللہ خاں نے خیر مقدم، کے نام سے ایک نظم پڑھی۔ نظم کے بعد سر راس مسعود مرحوم اور مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اظہارِ خیالات کیا۔ اور آخر میں علامہ مرحوم نے درج ذیل تقریر کی۔

.... اگرچہ سر راس مسعود اور سید سلیمان صاحب ندوی کی تقریروں کے بعد اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں ہے جسے میں بیان کروں۔ لیکن "انجمن ادبی کابل کے ارکان مجھ سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ خیر مقدم کے جواب میں، میں بھی کچھ عرض کروں۔ میں انجمن کا بے حد ممنون ہوں کہ اُس نے میرے متعلق نظم و نثر میں بہت اچھے خیالات اور پُر احساس جذبات ظاہر کیے ہیں۔ میں بھی خواہش رکھتا ہوں کہ انجمن، کے نوجوان ارکان کے عملی پہلو سے بحث کروں۔ میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوّری یا موسیقی یا معماری ان میں سے ہر ایک زندگی کی معاون[1] اور خدمت گار ہے۔ اسی بنا پر میں آرٹ کو ایجاد و اختراع سمجھتا ہوں نہ کہ محض آلۂ تفریح[2]۔ شاعر قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کر سکتا ہے اور برباد بھی۔ اس وقت جب کہ حکومت یہ کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ زمانے میں، افغانستان کی تاریخ ایک نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو اس مُلک کے شعراء پر لازم ہے کہ وہ نوجوان قوم کے سچے رہنما بنیں۔ زندگی کی عظمت اور بزرگی کے بجائے موت کو

---

[1] ۔ مددگار [2] تفریح کا سامان، تفریح کا ذریعہ۔

زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں ۔ کیونکہ جب آرٹ موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے ، تو اُس وقت وہ سخت خوفناک اور برباد کن ہو جاتا ہے ۔ اور جو حُسن قوت سے خالی ہو، وہ محض پیامِ موت ہے ؎

دلبری بے قاہری جادوگری است

دلبری با قاہری پیغمبری است

میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ کو ایک مرکزی نقطے کی طرف مبذول کروں ۔ حیاتِ نبوی ؐ کے واقعات میں سے ایک واقعہ کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے حضور[1] میں عرب کے مشہور شاعر امراء القیس کے کچھ اشعار پڑھے گئے ۔ ارشاد ہوا " اشعر الشعراء وقائدہم الی النار " یعنی تمام شاعروں میں بہترین شاعر اور ان کو دوزخ کی طرف لے جانے والا ۔

اِس ارشادِ سراسر رشاد[2] سے واضح ہے کہ شعر کا کمال بعض اوقات لوگوں پر بُرا اثر مرتب کرتا ہے ۔ کسی قوم کی زندگی کی موقوف[3] علیہ چیزیں محض شکل و صورت ہی نہیں ہیں بلکہ جو چیز حقیقتاً قوم کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے وہ " تخیل " ہے جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ بلند پایہ نظریات ہیں جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے ۔ قومیں شعراء کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں اور اہل سیاست کی پامردی[4] سے نشوونما پاکر اَمر[5] ہو جاتی ہیں ۔ پس میری خواہش یہ ہے کہ افغانستان کے شعراء اور انشاپرداز اپنے ہم عصروں میں ایسی روح پھونکیں جس سے وہ اپنے آپ کو پہچان سکیں ۔ جو قوم ترقی کے راستے پر چل رہی ہے اس کی انانیت[6] خاص تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے مگر وہ تربیت جس کا خمیر احتیاط کے ساتھ اٹھایا جائے پس اس انجمن کا کام یہ ہے کہ نوجوانوں،

؎ حُسن بغیر طاقت کے محض جادوگری ہے اور حُسن طاقت کے ساتھ مل کر پیغمبری بن جاتا ہے ۔

[1] سامنے روبرو [2] ۔ رہنمائی [3] وہ چیزیں جن پر کسی چیز کا دارومدار ہو ۔

[4] استقلال [5] غیر فانی ، ہمیشہ زندہ رہنے والی [6] خودی ۔

کے افکار کو ادبیات کے ذریعے متشکل کرے اور ان کو ایسی روحانی قوت بخشے کہ وہ بالآخر اپنی خودی کو پاکر اور قابلیت بہم پہنچا کر پکار اٹھیں ۔

من آں جہان خیالم کہ فطرتِ ازلی ‏ جہان بلبل و گل را شکست و ساخت مرا
نفس بہ سینہ گدازم کہ طائرِ حرمم ‏ تواں ز گرمیِ آوازِ من شناخت مرا[۱]

میں ایک نکتہ اور بھی کہتا ہوں ۔ مسولینی نے ایک اچھا نظریہ قائم کیا ہے کہ اٹلی کو چاہیئے کہ اپنی نجات حاصل کرنے کے لیے ایک کروڑ پتی کو پیدا کرے جو اس ملک کے گریباں کو اینگلوسیکسن اقوام کے قرضہ سے نجات دلا سکے ، یا کسی دوسرے دانتے کو جو ایک نئی جنت پیش کرے یا کسی نئے کولمبس کو پیدا کرے جو ایک نئے برّاعظم کا پتا لگائے اگر آپ مجھ سے دریافت کریں تو میں کہوں گا کہ افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس مُلک کو قبائلی زندگی سے نکال کر وحدتِ ملّی کی زندگی سے آشنا کر سکے ۔ اور مجھے خوشی ہے کہ افغانستان کو ایک ایسا مردِ کامل مل گیا ہے جس کا وہ عرصہ سے انتظار کر رہا تھا ۔ اور مجھے یقین ہے کہ اعلیٰحضرت نادر شاہ کی شخصیت کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ افغانستان کو ایشیا میں ایک نئی قوم بنا کر دنیا سے متعارف کریں ۔ اس ملک کے نوجوانوں کو چاہیئے کہ اس بزرگ رہنما کو اپنی تعلیم و تربیت کا معلم سمجھیں ۔ کیونکہ ان کی زندگی ایثار ، اخلاص اور اپنے ملک کے ساتھ صداقت اور اسلام کے ساتھ عشق و محبت سے لبریز ہے ۔

کابل والی تقریر میں حضرت علامہ نے جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

آرٹ یعنی ادبیات ، شاعری ، مصوّری ، موسیقی اور معماری وغیرہ کو زندگی کا معاون ہونا چاہیئے ۔ شاعر قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کر سکتا ہے اور برباد بھی ۔ اب جبکہ

---

[۱] ۔ میں وہ جہان خیال ہوں کہ خدا نے جہان بلبل و گل کو ختم کر کے مجھے پیدا کیا ہے ۔ میں طائرِ حرم ہوں نفس کو سینہ میں پگھلا دیتا ہوں ۔ بس میری گرمی آواز ہی سے ۔ مجھے پہچانا جا سکتا ہے ۔

خود حکومت کوشش کر رہی ہے کہ افغانستان ایک نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو اس مُلک کے شعراء پر لازم آتا ہے کہ وہ نوجوان قوم کے سچے رہنما بنیں - ان کو زندگی کی عظمت اور بزرگی سے روشناس کرائیں - موت کے بیان سے اجتناب کریں - کیونکہ جب آرٹ موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے تو وہ سخت خطرناک اور برباد کن ہو جاتا ہے -

دوسری بات آپ نے یہ فرمائی کہ جو حُسن قوت سے خالی ہو، وہ پیامِ موت ہے- آرٹ میں محض حسن پیدا کیا جائے اور اس کو قوت کا مظہر نہ بنایا جائے، تو ایسا آرٹ قوم میں زندگی پیدا کرنے کے بجائے اس کو ہلاکت کی نظر کر دے گا - اس بات کے ثبوت میں اقبال نے امراء القیس کی شاعری پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تبصرہ پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں اُس نے اپنے آرٹ میں حُسن تو بدرجہ اتم پیدا کیا مگر اس میں قوت پیدا نہ کر سکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی شاعری نے قوم کو بیدار اور فعال بنانے کی بجائے اس کو سُلانے بلکہ ہلاک کرنے کا سامان کیا - اس لیے اقبال نے خواہش ظاہر کی کہ افغانستان کے شعراء اور انشاپرداز اپنی قوم میں وہ روح پھونکیں جس سے وہ اپنے آپ کو پہچان سکیں کیونکہ اپنے آپ کو ، پہچاننے اور اپنی خودی کی صحیح نہج پر تربیت کے بغیر قوم میں زندگی کی روح نہیں پھونکی جا سکتی -

تیسری بات حضرت علامہ نے مسولینی کے حوالے سے کہی تھی جب تک کوئی قوم اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہوتی اور دوسروں کی مدد اور سہارے سے زندہ رہتی ہے وہ ترقی نہیں کر سکتی - اس لیے اپنے ملکی وسائل پر اعتماد کر کے اپنے ملک کو ترقی اور استحکام کے راستے پر ڈالنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے - افغان قوم کو ایک ایسے مردِ کامل کی ضرورت تھی جس کی پُرخلوص رہنمائی میں وہ ترقی کے راستے پر گامزن ہو، سکتی - سو خدا کا شکر ہے کہ اُس کو ایسا مردِ کامل نادر شاہ کی شکل میں مل گیا - پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایسے مردِ کامل کی رہنمائی اور جدوجہد سے دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کی صف میں اپنی جگہ نہ بنا سکیں ——————

۳۔ اقتباس از مضمون قومی زندگی

سب سے پہلے نبی عربؐ نے انسان کو فطری[1] آزادی کی تعلیم دی، اور غلاموں اور آقاؤں کے حقوق کو مساوی قرار دے کر اس تمدنی انقلاب کی بنیاد رکھی جس کے نتائج کو اس وقت تمام دنیا محسوس کر رہی ہے، ایسا کرنا، گویا نوع انسان کے ایک کثیر حصے کو اُس آزاد مقابلے کے میدان میں واپس لے آنا تھا جس کے اثر سے تمدن و تہذیب کی اعلیٰ صورتیں پیدا ہوتی ہیں، اور جو دنیا کی تمام تہذیب و شائستگی کی بیخ و بنیاد ہے۔ حکیم عربؐ کی اس مبارک تعلیم کا نتیجہ کیا ہوا؟ مسلمانوں میں غلام بادشاہ ہوئے، غلام وزیر ہوئے، غلاموں کو اعلیٰ تعلیم دی گئی۔ غلاموں میں فلسفی اور ادیب پیدا ہوئے۔ غرضیکہ اس قبیح[2] امتیاز کے مٹ جانے سے ہر غلام ایک اعلیٰ خاندان کے آدمیوں کے ساتھ عقلی مقابلہ کر سکتا تھا۔ اور اس مقابلے میں کامیاب ہو کر سلطنت کے اعلیٰ ترین مناصب[3] پر پہنچ سکتا تھا۔ اس تعلیم کا سب سے اعلیٰ نمونہ جناب فاروقؓ نے پیش کیا، جب کہ وہ بیت المقدس کی فتح کے لیے جا رہے تھے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے دنیا کی کسی قوم کی تاریخ ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ اور مسلمان اس تعلیم پر جس قدر ناز کریں بجا ہے علیٰ ہذا القیاس عورتوں کے حقوق کا نازک مسئلہ ہے جس کے متعلق حکیم عربؐ نے ایسی ہی آزادانہ تعلیم دی، مگر چونکہ یہ مضمون نہایت وسیع اور بحث طلب ہے، اس واسطے میں اسے یہاں نظر انداز کرتا ہوں، البتہ مناسب مقام پر اس کی طرف چند اشارات کروں گا۔

---

[1] پیدائشی قدرتی [2] بُرا [3] عہدے۔ مرتبے جمع منصب کی [4] اسی طرح

لیکن شرائطِ زندگی کے متعلق ایک اور غور طلب بات یہ ہے کہ کیا وہ تمام حالات جس پر کسی قوم کی زندگی کا دارومدار ہے، انسانی کوشش سے ایک خاص ترتیب میں جمع ہو سکتے ہیں بالفاظ دیگر قوم کی زندگی قوم کے اختیار میں ہے یا پودوں اور حیوانوں کی طرح افراد انسانی کی زندگی بھی قوائے[1] فطرت کے غیر اختیاری عمل پر منحصر ہے؟ اگرچہ زندگی کی اصلیت مخلوقات کی صورت میں وہی ہے، تاہم انسان اپنی عقل خداداد کی وجہ سے آفرینش کی ہر صورت سے متمیز[2] ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک ایسی قوت دی ہے جس کی وساطت[3] سے یہ شرائط زندگی کو سمجھ سکتا ہے اور ہر انقلاب کے لوازم[4] پر غور کر سکتا ہے اس کی گرفت ایسی زبردست ہے کہ یہ قدرت کے قوانین کو معلوم کر کے ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اپنے ارتقا[5] کو متعین کر سکتا ہے، جب یہ دیکھتا ہے کہ آبادی کی افزائش کے ساتھ زمین کی پیداوار قدرتی اسباب سے کم ہو رہی ہے تو یہ ان اسباب کا مقابلہ کرتا ہے اور مختلف اقسام کی ایجادوں سے اُن کی مخالفت کو روک کر اپنی زندگی کے سامان بہم پہنچاتا ہے اگر انسان عقل کے زیور سے معرّا[6] ہوتا تو ترقی، تہذیب و تمدّن کے لیے کوششیں کرنا بالکل بے سود ہوتا، ہماری زندگی حیوانوں اور درختوں کی طرح ہوتی۔ ہم کسی انقلاب کا مقابلہ نہ کر سکتے اور ہماری بقا و فنا کا انحصار محض قدرتی اسباب پر ہوتا، جن کی قوت کے سامنے ہم بالکل بے کس ہوتے۔

یہاں تک تو میں نے شرائطِ زندگی پر زیادہ تر فطری لحاظ سے بحث کی ہے، اب میں واقعات کی طرف آتا ہوں۔ جن سے میں چند ایسے نتائج پیدا کرنے کی کوشش کروں گا جو اہلِ ملک و قوم کے لیے عملی لحاظ سے مفید ہوں۔ . . . . .

اگر ہم متمدّن دنیا کی گزشتہ اور موجودہ تاریخ کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اقوام قدیمہ میں سے صرف چار قومیں ایسی ہیں جو قوانین زندگی کی تیز تلوار سے بچ کر بُری بھلی

---

[1] ۔ قدرت کی قوتیں ۔ [2] سب سے نمایاں ممتاز مختلف [3] ذریعہ [4] ضروری باتیں
[5] ترقی [6] ۔ خالی ۔ ننگا ۔

حالت میں اب تک صفحۂ ہستی پر قائم ہیں یعنی چینی، ہندو، بنی اسرائیل اور پارسی، حال کی قوموں میں سے دیگر مغربی اقوام کے علاوہ ایشیا میں جاپان اور فرنگستان میں اہل اطالیہ، دونوں قومیں ایسی ہیں جنہوں نے موجودہ تغیر کے مفہوم کو سمجھ کر اپنے تمدنی، اخلاقی اور سیاسی حالات کو اس کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن چونکہ دونوں ہندو اور چینیوں کی قومی زندگی کے اسباب اسرائیلیوں اور پارسیوں کی قومی زندگی کے اسباب سے بالکل مختلف ہیں اور جہاں تک مضمون زیر بحث کا تعلق ہے، ہمیں کوئی عملی فائدے بھی نہیں دے سکتے، اس واسطے میں ان دونوں قوموں کی دلچسپ اور حیرت انگیز سرگزشت کی طرف اشارہ نہیں کروں گا . . . . . .

اگرچہ یہ ساری قومیں، قومی زندگی کے اصل مفہوم کو ادا نہیں کرتیں، تاہم یہ بات کچھ تعجب خیز نہیں ہے کہ باوجود تمام خارجی یورشوں[1] کے جو ان کے ممالک پر وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں، باوجود صدہا سال کی غلامی اور ارضی و سماوی آفات کے جو ان قوموں نے برداشت کیں، ان کا نام و نشان اب تک قائم ہے بنی اسرائیل کی تاریخ ایک دردناک کہانی ہے جس کو ایک دردمند دل سن بھی نہیں سکتا۔ تاہم یہ قوم اپنے فطری قویٰ کے لحاظ سے اس قدر حیرت انگیز ہے کہ کوئی مشرقی و مغربی قوم سوائے ہندوؤں کے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی . . . . . .

سینکڑوں پیغمبر اس برگزیدہ قوم میں مبعوث[2] ہوئے، سینکڑوں شہنشاہ اور ہزاروں مقنن[3] پیدا ہوئے، جنہوں نے قوم کے تمدن اور اس کی تہذیب کو معراج کمال تک پہنچایا مگر آخر قہر الٰہی نے قوانین حیات کی صورت میں اپنا عمل کیا اور یہ قوم غلامی کی خوفناک مصیبتیں اٹھاتی وطن سے بے وطن ہوئی۔ نہ وہ عظمت، نہ وہ سلطنت، نہ وہ شوکت نہ وہ تہذیب، نہ وہ تمدن، غرضکہ پریشاں اور خستہ حال ہو کر مغربی ممالک میں منتشر ہو گئی اور اب تک غیر اقوام کی سختیاں اٹھا رہی ہے، باوجود ان تمام مصائب کے جو

---

[1] حملوں [2] زمینی اور آسمانی آفتیں [3] پیدا ہوئے [4] قانون داں، قانون کے ماہر

قوم بنی اسرائیل نے ، زمانے کے ہاتھوں برداشت کیے ، حیران کر دینے والی بات یہ ہے کہ یہ قوم اب تک زندہ ہے ، اگرچہ قومیت اور حکومت نہیں رہی تاہم دولت کا یہ حال ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں اس قوم کی مقروض ہیں اور اس دولت کے بل بوتے پر یہ قوم ایک عرصے سے اس تجویز کو عملی صورت دینے میں مصروف ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ سے اپنا آبائی وطن خرید کر اپنی پرانی عظمت و جلال کی از سرِ نو بنیاد رکھے۔

یہودیوں کو چھوڑ کر پارسیوں کی تاریخ پر نگاہ ڈالو، ایک زمانے میں عظیم الشان قوم تھی۔ یہودیوں کی طرح اس قوم میں بھی پیغمبر مبعوث ہوئے۔ کیانی تہذیب و تمدن انتہائی نقطہ تک پہنچا، آخر کار شہنشاہ یزدجرد کے عہد میں عربی تلواروں نے کیانی شائستگی کو صفحۂ عالم سے معدوم کر دیا اور موبدوں (پارسیوں کے پیشوا) کی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی آتش کدے ویران ہوئے۔ لیکن کیا یہ قوم صفحۂ ہستی سے مٹ گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں قوموں نے انقلاب کو کسی قدر سمجھ لیا ہے۔ جس کی سب سے بڑی خصوصیت صنعت و تجارت ہے، دنیا کی تجارت کا ایک کثیر حصہ ان کے ہاتھوں میں ہے اور یہی وجہ ان کے سنبھل جانے کی ہے۔

حال کی قوموں میں، اطالیہ تو خیر فرنگستانی ہیں، جاپانیوں کو دیکھو کس حیرت انگیز سرعت[1] سے ترقی کر رہے ہیں۔ ابھی تیس چالیس سال کی بات ہے کہ یہ تقریباً مردہ تھی۔ ۱۸۶۸ء میں جاپان کی پہلی تعلیمی مجلس قائم ہوئی۔ اس سے چار سال بعد یعنی ۱۸۷۲ء میں جاپان کا پہلا تعلیمی قانون شائع کیا گیا اور شہنشاہِ جاپان نے اس کی اشاعت کے موقع پر مندرجہ ذیل الفاظ کہے۔

"ہمارا مدّعا یہ ہے کہ اب سے ملک جاپان میں تعلیم اس قدر عام ہو کہ ہمارے جزیرے کے کسی گاؤں میں کوئی خاندان جاہل نہ رہے"

غرضیکہ ۳۶ سال کے قلیل عرصے میں مشرق اقصیٰ[2] کی اس مستعد قوم نے جو مذہبی

---

[1] ۔ جلدی تیزی [2] مشرق بعید۔

لحاظ سے ہندوستان کی شاگرد تھی ، دینوی اعتبار سے ممالکِ مغرب کی تقلید کر کے ترقی کے وہ جوہر دکھائے کہ آج دنیا کی سب سے زیادہ مہذب اقوام میں شمار ہوتی ہے اور محققینِ مغرب اس کی رفتارِ ترقی کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں جاپانیوں کی باریک بین نظر نے اس عظیم الشان انقلاب کی حقیقت کو دیکھ لیا اور وہ راہ اختیار کی جو ان کی قومی بقا کے لیے ضروری تھی۔ افراد کے دل و دماغ دفعتاً بدل گئے اور تعلیم و اصلاحِ تمدن نے قوم کی قوم کو اور سے کچھ اور بنا دیا۔ اور چونکہ ایشیا کی قوموں میں سے جاپان نے رموزِ حیات کو سب سے زیادہ سمجھا ہے ، اس واسطے یہ ملک دینوی اعتبار سے ہمارے لیے سب سے اچھا نمونہ ہے ہمیں لازم ہے کہ اس کے فوری تغیر کے اسباب پر غور کریں ، اور جہاں تک ، ہمارے ملکی حالات کی رو سے ممکن و مناسب ہو، اس جزیرے کی تقلید سے فائدہ اٹھائیں ۔

ان واقعات کی روشنی میں اگر ہندوستان کی حالت کو دیکھا جائے تو ایک مایوس کر دینے والا نظارہ سامنے آتا ہے ۔ کیا ہمارا ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہے ؟ اپنے مکان کے اسباب آرائش ہی کو دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ ذرا ذرا سی بات کے لیے ہم اقوام غیر کے محتاج ہیں اور روز بروز ہوتے جاتے ہیں ۔ آپ کا لیمپ جرمنی میں بنا ہے ، اس کی چمنی آسٹریلیا میں تیار ہوئی ہے ، اس کا تیل روس سے آیا ہے اور گندھک کی سلائی جس سے لیمپ روشن کیا جاتا ہے ، سویڈن یا جاپان سے پہنچی ہے ۔ کلاک جو آپ کی نشست گاہ کی دیوار پر آویزاں ہے ، امریکہ کے کارخانوں میں تیار ہوا تھا اور وہ چھوٹی سی گھڑی جو آپ کی جیب میں ٹک ٹک کر رہی ہے ، جینوا کے کاریگروں کی صنعت کا نمونہ ہے ۔ علی ہذا القیاس پہننے کا کپڑا ، ہاتھوں کی چھڑی ، چاقو قینچی ، دروازوں کی چلمنیں اور روزمرہ کے استعمال کی صدہا چیزیں غیر ملکوں کے کارخانوں میں تیار ہو کر آپ کے پاس پہنچتی ہیں ۔ ایسے حالات میں ، جب مصنوعات[2] اور تجارت

---

[1] یکایک [2] بنی ہوئی چیزیں ۔

کی طرف سے ہمارا ملک بالکل غافل ہو، یہ کس طرح ممکن ہوسکتا ہے کہ ہم مصارفِ زندگی میں، جس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے، کامیاب ہوں گے۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر اس اعتبار سے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو ان کی حالت نہایت مخدوش نظر آتی ہے۔ یہ بدقسمت قوم حکومت کھو بیٹھی ہے۔ صنعت کھو بیٹھی ہے، تجارت کھو بیٹھی ہے، اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح[1] ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا[2] ٹیکے کھڑی ہے اور باتیں تو خیر، ابھی تک ان کے مذہبی نزاعوں کا ہی فیصلہ نہیں ہوا۔ آئے دن ایک نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھ کر باقی تمام نوع انساں کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے۔ غرضیکہ ان فرقہ آرائیوں نے خیر[3] الامم کی جمعیت کو کچھ ایسی بری طرح منتشر کر دیا ہے کہ اتحاد و یگانگت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

مولوی صاحبان کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی شہر میں اتفاق سے دو جمع ہو جائیں تو حیاتِ مسیح یا آیاتِ ناسخ و منسوخ پر بحث کرنے کے لیے باہمی نامہ و پیام ہوتے ہیں اور اگر بحث چھڑ جائے اور بالعموم بحث چھڑ جاتی ہے تو ایسی جوتیوں میں دال بٹتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ پرانا علم و فضل، جو علمائے اسلام کا خاصہ تھا، نام کو بھی نہیں، ہاں مسلمان کافروں کی ایک فہرست ہے کہ اپنے دستِ خاص سے اس میں ہر روز اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ یہاں امرار کی عشرت پسندی کی داستان سب سے نرالی ہے خیر سے چار لڑکیاں اور دو لڑکے تو پہلے سے ہیں ابھی میاں تیسری بیوی کی تلاش میں ہے، اور پہلی دو بیویوں سے پوشیدہ کہیں کہیں پیغام بھیجتے رہتے ہیں، کبھی گھر کی جوت پیراز سے فرصت ہوئی تو بازار کی کسی حسن فروش نازنین سے بھی گھڑی بھر کے لیے آنکھ لڑا آئے۔ اوّل تو کسی کو جرأت نہیں کہ حضرت کو نصیحت کرے اور اگر کسی کو لب کشائی کا حوصلہ ہو تو چیں بجبیں ہو کر ارشاد فرماتے ہیں۔

---

[1] ۔ زخمی [2] ۔ لاٹھی، ڈنڈا ۔ [3] مسلمان قوم۔ ساری قوموں سے بہتر ہے۔

؎ تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

عوام کی کچھ نہ پوچھئے، کوئی اپنی عمر کا اندوختہ بچے کے ختنہ پر اُڑا رہا ہے، کوئی اُستاد کے خوف سے اپنے نازپروردہ لڑکے کا پڑھنا لکھنا چھڑا رہا ہے، کوئی دن بھر کی کمائی شام کو اڑاتا ہے اور کل کا اللہ مالک ہے، کہہ کر اپنے دل کو تسکین دیتا ہے کہیں ایک معمولی بات پر مقدمہ بازیاں ہو رہی ہیں، کہیں جائداد کے جھگڑوں سے جائدادیں فنا ہو رہی ہیں غرض کس کس کی شکایت کریں، لنکا میں جو ہے باون گز کا ہے۔ تمدن کی یہ صورت کہ لڑکیاں نا تعلیم یافتہ، نوجوان جاہل، روزگار ان کو نہیں ملتا۔ صنعت سے گھبراتے ہیں، حرفت کو عار سمجھتے ہیں، مقدماتِ نکاح کی تعداد ان میں روز بروز بڑھ رہی ہے، جرم کی مقدار روز افزوں ہے، دماغ شاہجہانی، آمدنی قلیل اور افلاس کا یہ عالم کہ ؎

رمضاں خوب مہینہ ہے مسلمانوں کا!

یہ وقت بڑا نازک وقت ہے اور سوائے اس کے کہ تمام قوم متفقہ طور پر اپنے دل و دماغ کو اصلاح کی طرف متوجہ کرے، کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ دنیا میں کوئی بڑا کام سعیِ بلیغ کے بغیر نہیں ہوا، یہاں تک کہ خدا تعالیٰ بھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم اپنی حالت خود نہ بدلے۔

(مخزن اکتوبر ۱۹۰۵ء)

مندرجہ بالا اقتباس کا خلاصہ یہ ہے:

سب سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کو فطری آزادی کی تعلیم دی۔ اور غلاموں اور آقاؤں کے حقوق کو مساوی قرار دے کر اس تمدنی انقلاب کی بنیاد رکھی جس کے نتائج کو اس وقت تمام دنیا محسوس کر رہی ہے اور اس تعلیم کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں میں غلام بادشاہ ہوئے، غلام وزیر ہوئے۔ غلاموں کو اعلیٰ تعلیم دی گئی۔ غلاموں میں فلسفی اور ادیب پیدا ہوئے اور اس تعلیم کا سب سے اعلیٰ نمونہ جناب فاروق رضؓ نے پیش کیا جب کہ وہ بیت المقدس کی فتح کے لیے جا رہے تھے۔

بیت المقدس کے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ کر رکھا

تھا۔ عیسائیوں نے ہمت ہار کر صلح کی درخواست کی اور مزید اطمینان کے لیے اس شرط کا اضافہ کیا کہ عمرؓ خود یہاں آئیں اور معاہدہ صلح ان کے ہاتھوں سے لکھا جائے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ ان کی درخواست پر ۱۶ھ کو مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اس سفر کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ اور غلام باری باری اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ اور اتفاق کی بات ہے کہ جب آپ بیت المقدس پہونچے تو غلام کی باری اونٹ پر بیٹھنے اور آپ کی اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلنے کی تھی۔ اس بات کو دیکھ کر عیسائی محو حیرت ہو گئے۔ اور شہر کا دروازہ کھول دیا گیا۔

اقبال فرماتے ہیں کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے دنیا کی تاریخ ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی اور مسلمان اس تعلیم پر جس قدر ناز کریں بجا ہے۔

دوسری بات اس اقتباس میں اقبال یہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ زندگی کی اصلیت مخلوقات کی صورت میں یکساں ہے تاہم انسان اپنی عقل خداداد کی وجہ سے کائنات کی ہر صورت سے مختلف ہے اللہ تعالیٰ نے اسے عقل کی ایک ایسی قوت دی ہے جس کے ذریعے یہ شرائط زندگی کو سمجھ سکتا ہے اور انقلاب کے لوازم پر غور کر سکتا ہے۔ اس کی گرفت ایسی زبردست ہے کہ یہ قدرت کے قوانین کو معلوم کر کے ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اپنے ارتقاء کے رخ کو متعین کر سکتا ہے۔

اس کے بعد اس نظری بحث کو چھوڑ کر اقبال واقعات کی طرف آتے ہیں اور دور حاضر کی قوموں میں سے جاپان اور اطالیہ کا ذکر کرتے ہیں کہ ان دو قوموں نے موجودہ "تغیر" کے مفہوم کو سمجھ کر اپنے تمدنی، اخلاقی اور سیاسی حالات کو اس کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے اور قدیم قوموں میں سے اسرائیل اور پارسیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ قومیں ایسی ہیں جو قوانین زندگی کی تیز تلوار سے بچ کر بڑی بھلی حالت میں اب تک صفحۂ ہستی پر قائم ہیں۔

جاپان کی تعریف کرتے ہیں کہ ۳۶ سال کے قلیل عرصے میں مشرق بعید کی اس مستعد قوم نے جو مذہبی لحاظ سے ہندوستان کی شاگرد تھی، دنیوی اعتبار ــــ

ممالک مغرب کی تقلید کے ذریعے ترقی کرکے وہ جوہر دکھائے کہ آج دنیا کی سب سے زیادہ مہذب اقوام میں شمار ہوتی ہے اور چونکہ ایشیا کی قوموں میں سے جاپان نے رموزِ حیات کو سب سے زیادہ سمجھا ہے اس لیے یہ ملک دینوی اعتبار سے ہمارے لیے سب سے اچھا نمونہ ہے۔ ہمیں لازم ہے کہ اس قوم کے فوری تغیّر کے اسباب پر غور کریں۔ اور جہاں تک ہمارے ملکی حالات کی رو سے ممکن و مناسب ہو اس جزیرے کی تقلید سے فائدہ اٹھائیں۔

اقبال، اس کے بعد ہندوستان کی حالت پر افسوس کرتے ہیں کہ آج اس ملک کی حالت یہ ہے کہ یہ ہر اعتبار سے دوسروں کا محتاج ہے اور اُن کے سہارے پر زندہ ہے ہندوستان کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر اس اعتبار سے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو ان کی حالت نہایت مخدوش ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے موجودہ مصائب تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

آخر میں فرماتے ہیں کہ یہ بڑا نازک وقت ہے اور سوائے اس کے ساری قوم متفقہ طور پر اپنے دل و دماغ کو اصلاح کی طرف متوجہ کرے کوئی فلاح کی صورت نظر نہیں آتی۔ دنیا میں کوئی بڑا کام سعیِ بلیغ کے بغیر نہیں ہوا۔ اور دنیا میں کسی قوم کی اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک کہ اُس قوم کے افراد کو اپنی اصلاح کی فکر نہ ہو۔

اگر ہم جاپان کی تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو اس وقت ہمیں دو چیزوں کی سخت ضرورت ہے۔ اصلاح تمدّن اور تعلیم عام مسلمانوں میں اصلاحِ تمدّن کا سوال درحقیقت ایک مذہبی سوال ہے کیونکہ اسلامی تمدّن اصل میں مذہبِ اسلام کی عملی صورت کا نام ہے۔ ہماری تمدّنی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اصول مذہب سے جدا ہو سکتا ہو۔ رہا تعلیمِ عام کا معاملہ تو اسلام نے آج سے ساڑھے تیرہ سو (۱۳۰۰) سال پہلے ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر حصولِ علم کو فرض قرار دیا تھا۔ پھر مسلمانوں کے تعلیم کے میدان میں سب سے پیچھے رہنے پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔

۴۔ اقتباس "از ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر

اب میں چند خیالات، اپنی قوم کے غُربا کی عام حالت کی اصلاح کے بارے میں ظاہر کرتا ہوں۔ اس ضمن[1] میں عام طبقہ کے مسلمانوں کی اقتصادی[2] حالت، سب سے پہلے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہو گا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوسناک اور قابلِ رحم ہے۔ شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزوِ غالب[3] مسلمان ہیں، معمولی درجے کے مسلمانوں کی قلیل اُجرت غلیظ مکان اور اُن کے پیٹ بھر روٹی کو ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا۔ لاہور کے کسی اسلامی محلّے میں جا نکلو، ایک تنگ و تاریک گوچے پر تمہاری نظر پڑے گی جس کے وحشت[4] زا سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچوں کی چیخ و پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت[5] آمیز صدا توڑتی ہو گی، جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقعے میں سے نکل کر خیرات کے لیے پھیلی ہوئی ہوں گی یہ تو گلی کی حالت تھی۔ غم زدہ گھروں کے اندر جا کے دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنھوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منہ میں اُڑ کر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خود داری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لیے کسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں، ہمارے نوجوان، علم برداران اصلاحِ تمدّن، جو پردے کی رسم کو ہماری قوم کے قویٰ کے روز افزوں انحطاط کا باعث قرار

---

[1] سلسلے میں [2] مالی [3] بڑا حصّہ [4] وحشت پیدا کرنیوالا [5] عاجزی، خوشامت، منت، سماجت۔

دینے کے عادی ہیں ، شاید یہ نہیں جانتے کہ اس انحطاط کا اصل ذمہ دار پردہ نہیں ، بلکہ یہ جاں[1] فرسا افلاس ہے جو ہماری قوم کے ادنیٰ و اقاصی[2] کو کھائے جا رہا ہے ۔ علاوہ اس افلاس کے ایک اور طبقہ اُن نکمّے اور نکھٹو افراد کا ہے جو اپنے جیسی ناکارہ اولاد پیدا کر کے سُستی اور کاہلی اور بداعمالی و سیہ کاری کی زندگی خود بھی بسر کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنا سا بنا لیتے ہیں ۔ کیا ہم نے عُقدہ[3] کے ان پہلوؤں پر بھی نظر ڈالی ہے ؟ کیا ہم نے کبھی اس بات کو محسوس کیا ہے کہ ہماری انجمنوں اور مجلسوں کا فرض یہ نہیں ہے کہ خاص خاص اشخاص کی کلاہ افتخار و اعزاز میں بیٹھے ہوئے طرّے لگایا کریں ، بلکہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی سطح کو اونچا کریں ۔

سب سے زیادہ اہم عُقدہ اس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے ، یہ ہے کہ کیوں کر اپنی قوم کی اقتصادی حالت کو سُدھارے ۔ اس کا فرض یہ ہے کہ ہندوستان کی عام اقتصادی حالت پر نظر غائر[4] ڈال کر ان سب اسباب کا پتہ لگائے جنہوں نے ملک کی یہ حالت کر دی ہے ۔ اس کا یہ فرض ہے کہ کسی اور مسئلے پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ ملک کی عام اقتصادی حالت میں کس حد تک ان بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے حصّہ لیا ہے جو آج کل کی دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں ۔ کس حد تک اہلِ ملک کی تاریخی روایات ، عادات ، اوہام[5] اور اخلاقی کمزوریوں نے حصّہ لیا ہے ۔ اور اگر گورنمنٹ کے طرزِ عمل کا بھی اس میں کوئی حصّہ ہے تو وہ کس حد تک ہے ۔ جو شخص اس گتھی کو سلجھانے کا بیڑا اٹھائے اُسے چاہیئے کہ مذہب و ملّت کے اختلاف کی طرف سے مطلقاً خالی الذہن ہو جائے اور کسی ایک جماعت کی طرفداری یا پاسداری کے خیال کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے ۔ اس لیے کہ اقتصادی قوتیں تمام قوموں پر اپنا عمل یکساں کرتی ہیں یہ شرحِ مالگذاری کا آئے دن کا اضافہ مُسکراتِ[6] ممالکِ غیر کی اس ملک میں درآمد ، قیمتِ اجناس کی گرانی ، (خواہ اس

---

[1] جان لیوا [2] بہت دُور والے [3] پیشکل بات [4] گہری نظر [5] وہم کی جمع ہے [6] نشہ آور چیزیں ۔

گرانی کا باعث یہ ہو کہ سکۂ رائج الوقت کے متعلق حکومت کے قائم کیے ہوئے اصول غلط ہیں، یا یہ کہ ایک زراعتی ملک اور صنعتی ملک کے درمیان آزاد تجارت کا سلسلہ قائم کر دیا گیا ہے، یا کوئی اور سبب ہو) یہ تمام امور ایسے ہیں جو مسلمانوں، ہندوؤں سکھوں اور پارسیوں کی اقتصادی حالت پر یکساں موثر ہو کر نہایت بلند[1] آہنگی سے منادی کر رہے[2] ہیں کہ مختلف جماعتوں کے اہل الرائے[3] اور مقتدا[4] اگر اور باتوں میں نہیں تو اقتصادیات میں ضرور آپس میں سر جوڑ کر مشورہ کر سکتے ہیں۔ اور ملک کی مشترکہ فلاح کی تدابیر پر غور کر سکتے ہیں لیکن مسلمان رہنمایانِ قوم نے اب تک اپنی تمام توجہ اس مسئلے پر صرف کئے رکھی ہے کہ سرکاری نوکریاں ہم لوگوں کو بہ حصہ رسد ملتی رہیں یہ کوشش بجائے خود ضروری اور قابل ستائش ہے اور تاوقتیکہ مسلمانوں کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو، ہمارے سربرآوردگان ملّت کو برابر اس کوشش میں سرگرمی کے ساتھ مصروف رہنا چاہیے، لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی انہیں مدِنظر رکھنی چاہیئے کہ دولت کی پیداوار کا ذریعہ ہونے کے لحاظ سے سرکاری ملازمت ایک نہایت ہی محدود ذریعہ ہے۔ سرکاری ملازمت کی تعداد محدود ہے چند اشخاص کو ضرور آسودہ اور خوش حال بنا دیتی ہے۔ لیکن قوم کے تمام افراد اُس صورت میں آسودہ اور خوش حال ہو سکتے ہیں۔ جب کہ ان کو اقتصادی آزادی نصیب ہو اس میں بھی شک نہیں کہ اگر کسی قوم کے چند افراد حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوں تو اس قوم کی عزت اور خودداری میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ اقتصادی سرگرمی کے اور بہت سے اصناف ایسے ہیں جو اہمیت اور سودمندی میں سرکاری ملازمت کے لگ بھگ ہیں۔ جس قوم کو اپنے اسلاف سے سپاہیانہ صفات ترکہ میں پہنچی ہوں، اس کے لیے سپہ گری کے تصورات کو چھوڑ کر تجارت اور صنعت و حرفت کی ڈگر پر چلنا یقیناً تکلیف دہ ہے۔ لیکن چونکہ مغربی اقوام کی دیکھا دیکھی ایشیا کی تمام قوموں کی اقتصادی

---

[1] بلند آواز سے [2] اعلان کر رہے ہیں [3] عقلمند لوگ [4] رہنما۔

حالت تغیر پذیر ہوتی جاتی ہے لہذا یہ کودوں[1] تو دلنی ہی پڑے گی۔ علاوہ ان اقتصادی مشکلات کے دفع کرنے کے جو ہماری سنگِ راہ ہیں، ہمیں صنعتی تعلیم پر بھی ضرور توجہ صرف کرنی چاہیئے جو میری رائے میں اعلیٰ تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ صنعتی تعلیم سے عامہ[2] خلائق کی اقتصادی حالت سدھرتی ہے اور یہی طبقہ قوم کے لیے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے۔ بخلاف اس کے اعلیٰ تعلیم صرف ان چند افراد کو نفع پہنچاتی ہے جن کی دماغی قابلیت درجہ اوسط سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے ہمارے اغنیا[3] کے بذل وجود کا مصرف ایسا ہونا چاہیئے کہ عام مسلمانوں کے بچے ارزاں تعلیم حاصل کر سکیں لیکن صنعتی اور تجارتی تعلیم بلا کسی اخلاقی تربیت کے بجائے خود کافی و مکتفی نہیں ہے اقتصادی مقابلہ میں تربیت کے اخلاقی عنصر کی کچھ کم ضرورت نہیں پڑتی، اعتماد باہمی، دیانتداری، پابندی اوقات اور تعاون وہ اقتصادی اوصاف ہیں جو مہارت فن کی برابر کی جوڑ ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے کارخانے محض اس لیے نہ چل سکے کہ کارخانہ داروں کو نہ ایک دوسرے پر بھروسہ تھا اور نہ اصول امداد باہمی کا اُن کا لحاظ ہوتا تھا۔ اگر ہم اچھے کاریگر، اچھے دوکاندار، اچھے اہلِ حرفہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اچھے شہری پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ انہیں اوّل پکا مسلمان بنائیں۔

یہ اقتباس حضرت علامہ کے اس لیکچر سے لیا گیا ہے جو انہوں نے ۱۹۱۰ء کے آغاز میں اسٹریچی ہال ایم اے او کالج علی گڑھ میں دیا تھا۔ اصل لیکچر انگریزی زبان میں تھا۔ حضرت مولانا ظفر علی خاں نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا اور مئی ۱۹۱۱ء میں برکت علی اسلامیہ ہال لاہور میں اس کو ایک عام جلسے میں پڑھ کر سنایا۔ یہ جلسہ اسی لیکچر کی خاطر منعقد کیا گیا تھا۔ حضرت علامہ بھی اس جلسے میں شریک تھے۔

اس لیکچر کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ علامہ مرحوم ادب و فلسفہ کے علاوہ عمرانیات کے بھی نہایت بالغ نظر عالم اور ماہر تھے۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل

---

[1] سخت کام [2] عوام [3] مالدار غنی کی جمع

پر ان کی بڑی گہری نظر تھی ۔ اس مضمون میں اسلام پر مجلسی اور معاشی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے ۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ نے حکمتِ ایمانی اور مصلحتِ عمرانی کا مطالعہ ، ایک دوسرے سے تعلق کی روشنی میں، بڑی دقتِ نظر سے کیا ہے [1]

اس اقتباس میں اقبال نے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کی اس وقت کی معاشرتی حالت یعنی اُن کی اقتصادی حالت پر روشنی ڈالی ہے ۔ ہندوستان کی عام حالت ہی درماندہ ہے۔ مگر مسلمانوں کی حالت کچھ زیادہ ناگفتہ بہ ہے ۔ اس حالت کے اسباب بیان کرنے کے بعد انہوں نے اس کے دور کرنے کی تجاویز بھی بتائی ہیں۔ اور مسلمان رہنماؤں اور سماجی کارکنوں کو اس طرف متوجہ کیا ہے کہ وہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس امر کی طرف توجہ کریں کہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت درست ہو جائے کہ اس کے درست ہونے سے ان کی عام حالت خود بخود درست ہو جائے گی ۔

اقبال نے مسلمان رہنماؤں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اول اس بات کا پتہ چلائیں کہ مسلمانوں کی اقتصادی پس ماندگی کے اسباب کیا ہیں ؟ ان کی عام اقتصادی حالت میں کس حد تک ، ان بڑی اقتصادی قوتوں نے حصّہ لیا ہے جو آج کل کی دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں ؟ کس حد تک اہل ملک کی تاریخی روایات ، عادات ، اوہام ، اور اخلاقی کمزوریوں نے حصّہ لیا ہے اور اگر گورنمنٹ کے طرزِ عمل کا بھی اس میں کوئی حصّہ ہے تو وہ کس حد تک ہے ؟ اور جو شخص اس گتھی کو سلجھانے کا بیڑا اٹھائے اسے چاہیئے کہ مذہب و ملّت کے اختلاف کی طرف سے مطلقاً خالی الذہن ہو جائے ۔ اور کسی ایک جماعت کی طرفداری یا پاسداری کے خیال کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے ۔ اس لیے کہ اقتصادی قوتیں تمام قوموں پر اپنا عمل یکساں کرتی ہیں ۔ شرح مالگذاری کا آئے دن کا اضافہ ، مسکرات ممالک غیر کی اس ملک میں درآمد ، قیمت اجناس کی گرانی یہ تمام امور

---

[1] ۔ مستفاد از تمہید ۔ کتابچہ ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر ۔

ایسے ہیں جو مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور پارسیوں وغیرہ کی اقتصادی حالت پر یکساں موثر ہو کر نہایت بلند آہنگی سے اعلان کر رہے ہیں کہ مختلف جماعتوں کے دانشور اور رہنما، اور باتوں میں نہیں تو اقتصادیات ہی میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور مشورہ کریں اور ملک کی مشترکہ فلاح کی تدابیر پر غور کریں۔

اقبال نے مسلمانوں کو خاص طور پر اس طرف متوجہ کیا ہے کہ وہ ملازمت ہی تک نہ رہیں بلکہ تجارتی اور صنعتی تعلیم میں کمال پیدا کر کے صنعت و تجارت کے ذریعے اپنی خوشحالی کے اسباب پیدا کریں۔ فرماتے ہیں، جس قوم کو اپنے اسلاف سے سپاہیانہ روایات ترکہ میں ملی ہوں اس کے لیے سپہ گری کے تصوّرات کو چھوڑ کر تجارت اور صنعت و حرفت کی ڈگر پر چلنا یقیناً تکلیف دہ ہے۔ لیکن رفتارِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے ان کو یہ کڑوی گولی تو نگلنی ہی پڑے گی۔ ملازمت سے چند اشخاص کو فائدہ پہنچتا ہے کہ ملازمت محدود ہوتی ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں تجارت و صنعت کے ذریعے عام لوگوں کی حالت درست ہوتی ہے۔

اور آخر میں اقبال ایک ایسی ہدایت فرماتے ہیں جو انہی کا کام ہے، فرماتے ہیں صنعتی اور تجارتی تعلیم بدون اخلاقی تربیت کے ناکافی ہو گی، اس لیے اخلاقی تربیت کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ فرماتے ہیں، بہت سے کارخانے محض اس وجہ سے چل سکے کہ کارخانہ داروں کو نہ ایک دوسرے پر اعتماد تھا اور نہ اصولِ امداد باہمی ان کے رہنما تھے۔ لہٰذا سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر ہم اچھے کاریگر، اچھے دوکاندار، اچھے اہل حرفہ اور سب سے بڑھ کر اچھے شہری پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ سب سے پہلے انہیں پکا مسلمان بنائیں۔

۵۔ محفلِ میلاد النبیؐ

"زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے، انسانوں کی طبائع[1] ان کے افکار[2] اور ان کے نقطہ ہائے نگاہ بھی زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا تہواروں کے منانے کے طریقے اور مراسم بھی ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ اور ان سے استفادے[3] کے طریقے بھی بدلتے رہتے ہیں ہم کو چاہیئے کہ ہم بھی اپنے مقدس دنوں کے مراسم[4] پر غور کریں اور جو تبدیلیاں افکار کے تغیرات سے ہونی لازم ہیں اُن کو مدِنظر رکھیں۔

منجملہ اُن مقدس ایّام کے جو مسلمانوں کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔ ایک میلاد النبیؐ کا دن بھی ہے۔ میرے نزدیک انسانوں کو دماغی اور قلبی تربیت کے لیے ضروری ہے کہ ان کے عقیدے کی رو سے زندگی کا جو نمونہ بہترین ہو، وہ ہر وقت ان کے سامنے رہے چنانچہ مسلمانوں کے لیے اسی وجہ سے ضروری ہے کہ وہ اسوۂ رسول[5] کریمؐ کو مدِنظر رکھیں تاکہ جذبۂ تقلید اور جذبۂ عمل قائم رہے ان جذبات کو قائم رکھنے کے تین طریقے ہیں۔

پہلا طریقہ تو درود صلوٰۃ ہے۔ جو مسلمانوں کی زندگی کا جزوِ لاینفک[6] ہو چکا ہے۔ وہ ہر وقت درود پڑھنے کے موقعے نکالتے رہتے ہیں عرب کے متعلق میں نے سنا ہے کہ اگر کہیں دو آدمی لڑ پڑتے ہیں، اور تیسرا بآواز بلند اَللّٰھم صلِّ علیٰ سیّدنا وبارک وسلم پڑھ دیتا ہے تو لڑائی فوراً رک جاتی ہے اور متخاصمین[7] ایک دوسرے پر ہاتھ اٹھانے سے فوراً باز آجاتے ہیں۔ یہ درود کا اثر ہے اور لازم ہے کہ جس پر درود پڑھا

---

[1] طبیعتیں [2] ذکر کی جمع ہے [3] فائدہ اٹھانا [4] رسومات [5] رسولؐ کا نمونہ۔
[6] کبھی جدا نہ ہونے والا [7] لڑنے والے۔

جائے اس کی یاد قلوب کے اندر اپنا اثر پیدا کرے۔

پہلا طریقہ انفرادی ہے۔ دوسرا اجتماعی ہے یعنی مسلمان کثیر تعداد میں جمع ہوں اور ایک شخص جو حضور آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات سے پوری طرح واقف ہو ——————— آپ کے سوانح حیات بیان کرے تاکہ ان کی تقلید کا ذوق وشوق مسلمانوں کے قلوب میں پیدا ہو.....

تیسرا طریق اگرچہ مشکل ہے، لیکن بہرحال اُس کا بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ یادِ رسولؐ اس کثرت سے اور ایسے انداز میں کی جائے کہ انسان کا قلب نبوّت کے مختلف پہلوؤں کا خود مظہر ہوجائے۔ یعنی آج سے تیرہ سو سال پہلے کی جو کیفیت حضورؐ سرورِ عالم کے وجود مقدس سے ہویدا[1] تھی وہ آج تمہارے ہمارے قلوب کے اندر پیدا ہو جائے۔ حضرت مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

آدمی دیداست باقی پوست است
دیدآں باشد کہ دید دوست است[2]

یہ جوہر انسانی کا انتہائی کمال ہے کہ اُسے دوست کے سوا اور کسی چیز کی دید سے مطلب نہ رہے۔ یہ طریقہ مشکل ہے کتابوں کو پڑھنے یا میری تقریر سننے سے نہیں آئے گا اس کے لیے کچھ مدت نیکوں اور بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر روحانی انوار حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر یہ میسر نہ ہو، تو پھر ہمارے لیے یہی طریقہ غنیمت ہے جس پر ہم آج عمل پیرا ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس طریق پر عمل کرنے کیلئے کیا کیا جائے؟ پچاس سال سے شور برپا ہے کہ مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنی چاہیے لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے، تعلیم سے زیادہ اس قوم کی تربیت ضروری ہے اور ملّی اعتبار سے یہ تربیت علماؔ کے ہاتھ

---

[1] ظاہر [2] ترجمہ۔ آدمی اصل میں دید ہی ہے اور دید کے علاوہ باقی سب پوست ہے اور دید، دوست کے دیدار کا نام ہے۔

میں ہے ۔ اسلام ایک خالص تعلیمی تحریک ہے ۔ صدرِ[1] اسلام میں اسکول نہ تھے، کالج نہ تھے ۔ یونیورسٹیاں نہ تھیں، لیکن تعلیم و تربیت اس کی ہر چیز میں ہے خطبۂ جمعہ، خطبۂ عید، حج، وعظ غرض تعلیم و تربیتِ عوام کے بے شمار مواقع اسلام نے بہم پہنچائے ہیں لیکن افسوس کہ علماء کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم نہیں رہا ۔ اور اگر کوئی رہا بھی تو اس کا طریق عمل ایسا رہا کہ دین کی حقیقی روح نکل گئی ۔ جھگڑے پیدا ہو گئے اور علماء کے درمیان، جنہیں پیغمبر علیہ السلام کی جانشینی کا فرض ادا کرنا تھا، سر پھٹول ہونے لگی ۔ مصر، عرب، ایران، افغانستان، ابھی تہذیب و تمدن میں ہم سے پیچھے ہیں ۔ لیکن وہاں علماء ایک دوسرے کا سر نہیں توڑتے ۔ وجہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک نے اخلاق کے اس معیارِ اعلیٰ کو پا لیا ہے جس کی تکمیل کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے تھے اور ہم ابھی اس معیار سے بہت دور ہیں ۔

دنیا میں نبوت کا سب سے بڑا کام تکمیلِ اخلاق ہے ۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا بعثتُ لِاُتمِّمَ مکارمِ اخلاق میں نہایت اعلیٰ اخلاق کے اتمام[2] کے لیے بھیجا گیا ہوں ۔ اس لیے علماء کا فرض ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہمارے سامنے پیش کریں ۔ تاکہ ہماری زندگی حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی تقلید سے خوشگوار ہو جائے اور اتباعِ[3] سنت زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں تک میں جاری و ساری ہو جائے ۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے خربوزہ لایا گیا تو آپ نے کھانے سے اس لیے انکار کر دیا کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ نبی کریمؐ نے یہ پھل کس طرح کھایا ہے ۔ مبادا ترکِ سنت کا ارتکاب ہو جائے ۔

افسوس کہ ہم میں بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بھی موجود نہیں ہیں، جن سے ہماری زندگی خوشگوار ہو اور ہم اخلاق کی فضا میں زندگی بسر کر کے ایک دوسرے کے لیے باعثِ رحمت ہو جائیں ۔ اگلے زمانے کے مسلمانوں میں اتباعِ سنت سے ایک اخلاقی ذوق اور ملکہ پیدا ہو جاتا تھا اور وہ ہر چیز کے متعلق خود ہی اندازہ کر لیا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ اس چیز کے متعلق کیا ہو گا ۔

---

[1] آغازِ اسلام، ابتدائے اسلام ۔ [2] پورا کرنا [3] سنت کی پیروی ۔

حضرت مولانا روم بازار میں جا رہے تھے۔ آپ کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ ان سب نے مولانا کو سلام کیا اور مولانا ایک ایک کا سلام الگ الگ قبول کرنے کے لیے دیر تک کھڑے رہے۔ ایک بچہ کہیں دور کھیل رہا تھا اس نے وہیں سے پکار کر کہا کہ حضرت ابھی جایئے گا نہیں، میرا اسلام لیتے جایئے تو مولانا نے بچے کی خاطر دیر تک توقف فرمایا اور اس کا سلام لے کر گئے۔ کسی نے پوچھا۔ حضرت آپ نے بچے کے لیے اس قدر توقف کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کا واقعہ پیش آتا تو حضورؐ بھی ایسا ہی کرتے۔

گویا ان بزرگوں میں تقلیدِ رسول اور اتباعِ سنّت سے ایک خاص اخلاقی ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں، علما کو چاہیے کہ ان کو ہمارے سامنے پیش کریں۔ . . .

چونکہ مسلمان اور بالخصوص ہند و پاکستان کے مسلمان سالانہ عید میلاد النبیؐ بڑے اہتمام سے مناتے ہیں اس لیے اقبال کے اس مضمون کو شاملِ نصاب کیا جاتا ہے کہ طلبا شروع ہی سے اس تقریب کی وجہ سے اور اس کے منانے کی افادیت سے واقف ہو جائیں تاکہ آگے چل کر وہ حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کر کے اپنی زندگیوں کو انفرادی و اجتماعی طور پر خوشگوار بنا سکیں۔

اقبال نے اپنے مضمون میں عید میلاد منانے کے تین طریقے بتلائے ہیں۔

پہلا طریقہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر دُرود بھیجنے کا ہے اور اس پر مسلمان شدت سے قائم ہیں۔ دن اور رات میں جب بھی موقع ملتا ہے نہایت درجہ عقیدت و محبت سے دُرود بھیجتے رہتے ہیں۔ اس سے حضور کے ساتھ قلبی و روحانی رابطہ قائم ہوتا ہے اور یہ رابطہ ایک مسلمان کی زندگی پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس اثر کی ایک مثال بھی دی ہے جو بارہا مشاہدہ میں آچکی ہے کہ اگر دو عرب کسی بات پر لڑتے ہوں اور تیسرا شخص بآوازِ بلند دُرود شریف پڑھ دیتا ہے تو وہ لڑنے والے ایک دوسرے پر ہاتھ اٹھانے سے فوراً باز آجاتے ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ بتایا ہے کہ مسلمان کثیر تعداد میں کسی جگہ جمع ہوں اور ایک شخص جو حضورؐ کے حالاتِ زندگی سے پوری طرح واقف ہو، آپ کے حالاتِ زندگی بیان کرے تاکہ ان کی تقلید کا مسلمانوں کے دلوں میں ذوق و شوق پیدا ہو۔ یہ طریقہ بھی مسلمانوں میں مروج ہے۔ ربیع الاوّل کے مہینے میں خاص طور پر اس قسم کے اجتماعات اور مجالس ہوتی ہیں۔

تیسرا طریقہ یہ بتایا ہے کہ حضورؐ کی یاد اس کثرت سے اور ایسے انداز سے کی جائے کہ انسان کا قلب نبوّت کے مختلف پہلوؤں کا خود مظہر ہو جائے۔ یعنی آج سے تیرہ سو سال پہلے جو کیفیت حضورؐ سرورِ عالم کے وجودِ مقدس سے ہویدا تھی وہ آج بھی ہمارے دلوں میں پیدا ہو جائے۔ مگر اقبال فرماتے ہیں کہ یہ تیسرا طریقہ بہت مشکل ہے یہ کتابوں کے پڑھنے یا تقریروں کے سننے سے نہیں آتا۔ اس کے لیے کچھ مدّت نیکوں اور بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر روحانی انوار حاصل کرنا ضروری ہے، اور اگر یہ بات میسّر نہ آسکے تو پھر یہی دوسرا طریقہ غنیمت ہے۔

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس طریقے پر عمل کرنے کے لیے کیا کیا جائے؟ اقبال فرماتے ہیں کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ بلکہ تعلیم سے کہیں زیادہ قوم کی تربیت ضروری ہے۔ اور ملّی اعتبار سے یہ تربیت علماء کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن افسوس کہ علماء کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم نہیں رہا۔ اور اگر کوئی رہا بھی تو اس کے طریقِ عمل سے دین کی حقیقی روح نکل گئی، جھگڑے پیدا ہو گئے، اور علماء کے درمیان جنہیں پیغمبر کی جانشینی کا فرض ادا کرنا تھا سر پھٹول ہونے لگی۔

دنیا میں نبوّت کا سب سے بڑا کام تکمیلِ اخلاق ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا ہے۔ بعثت لاتمّم مکارم الاخلاق۔ میں نہایت اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اس لیے علماء کا فرض ہے کہ وہ رسول اللہؐ کے اخلاق ہمارے سامنے پیش کیا کریں تاکہ ہماری زندگی حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی تقلید سے خوشگوار ہو جائے۔

مکاتیبِ اقبال

خطوط کے مطالعہ کے بعد اقبال کی ذات سے متعلق جو امتیازات مجھے نظر آئے ہیں ان میں ان کا خلوص، ان کی علم دوستی، اسلام سے ان کی شیفتگی[1]، ہندوستان کے مسلمانوں کی زبوں حالی پر ان کی دل سوزی[2] اور اصلاحِ حال پر ان کی کوشش، ممالکِ اسلامیہ کے اتحاد و استقلال و استحکام کی تجاویز اور کوشش، اہل و عیال سے محبت، دوستوں کے لیے جذبہ مروّت اور عالمِ انسانیت کے لیے فلاح و خیر[3] سگالی کے جذبات نمایاں ہیں۔

ان مکاتیب میں علاّمہ نے زبان کی سادگی کو ہاتھ سے نہیں دیا اور انشا پردازی کے جوہر دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ جہاں کہیں موضوع کی دل کشی نے موقع دیا ہے انہوں نے جو خیالات ذوق و شوق اور جوشِ قلبی سے قلمبند[4] کر دیے ہیں ان میں زبان کی دل فریبی بدرجہ غایت[5] موجود ہے۔

حضرت گرامی کو ۱۹۱۸ء میں لکھتے ہیں۔

"گرامی کو خاک پنجاب جذب کرے گی یا خاک دکن"

اس سوال کے جواب میں حسب الحکم مراقبہ کیا گیا۔ جو انکشاف ہوا عرض کیا جاتا ہے۔ گرامی مُسلم ہے اور مسلم تو وہ خاک نہیں کہ خاک اُسے جذب کر سکے۔ یہ ایک قوتِ نورانیہ ہے جو جامع ہے جواہر موسوّیت اور ابراہیمیت کی۔ آگ اُسے چھو جائے تو بَرد و سلاما بن جائے پانی اس کی ہیبت سے خشک ہو جائے۔ آسمان و زمین میں یہ سما نہیں سکتی کہ یہ دونوں

---

[1] عشق [2] ہمدردی [3] خیر خواہی [4] تحریر کر دینا۔ [5] بہت زیادہ

ہستیاں اس میں سمائی ہیں ۔ پانی آگ کو جذب کرلیتا ہے ، عدم بود کو کھا جاتا ہے ، پستی بلندی میں سما جاتی ہے ، مگر جو قوت جامع[1] اضداد ہو اور محلّل[2] تمام تناقضات[3] کی ہو ، اسے کون جذب کرے ۔ مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی قوتِ حیات و موت کو اپنے اندر جذب کرکے حیات و ممات کا تناقض مٹا چکی ہے ۔ . . . . البتہ زمان و مکان کی مقیّد دنیا کے مرکز میں ایک ریگستان ہے جو مسلم کو جذب کر سکتا ہے اور اس کی قوتِ جاذبہ ذوقی و فطری نہیں بلکہ مستعار ہے ، ایک کفِ پا[4] سے جس نے اس ریگستان کے چمکتے ذرّوں کو کبھی پامال کیا ہے ،،

منشی محمد دین فوق کو لکھتے ہیں چونکہ نفسِ مضمون اقبال کے لیے دل کشی رکھتا تھا اس لیے خوب لکھا ۔ اقبال ولایت کے پہلے سفر کے دوران میں سوئٹزر پہنچے تو مسلمان تاجروں کی ایک کثیر تعداد جہاز پر آن موجود ہوئی اقبال ان میں سے ایک سے سگریٹ خریدتے ہوئے اسے بتاتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں ۔ مگر اقبال کے سر پر ہیٹ دیکھ کر اُسے تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے ۔

،، آخر یہ شخص میرے اسلام کا قائل ہوا اور چونکہ حافظِ قرآن تھا اس واسطے میں نے چند آیات قرآن شریف کی پڑھیں تو نہایت خوش ہوا اور میرے ہاتھ چومنے لگا ۔ باقی تمام دوکانداروں سے مجھے ملایا ۔ اور وہ سب میرے گرد حلقہ باندھ کر ماشاء اللہ ماشاء اللہ کہنے لگے اور میری غرضِ سفر معلوم کرکے دعائیں دینے لگے یا یوں کہیے کہ دو چار منٹ کے لیے وہ تجارت کی پستی سے اُبھر کر اسلامی[5] اخوت کی بلندی پر جا پہنچے ۔ تھوڑی دیر کے بعد مصری نوجوانوں کا ایک نہایت خوبصورت گروہ جہاز کی سیر کے لیے آیا ۔ میں نے جب نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کے چہرے اس قدر مانوس معلوم ہوتے تھے کہ مجھے ایک سیکنڈ کے لیے علی گڑھ

---

[1] مختلف چیزوں کو جمع کرکے رکھنے والی [2] حل یا ختم کرنے والی [3] اختلافات [4] تلوا [5] بھائی چارہ ۔

کالج ڈیپوٹیشن کا شبہ ہوا۔ یہ لوگ جہاز کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ میں بھی دخل در معقولات، اُن میں جا گھسا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ان میں سے ایک نوجوان ایسی خوبصورت عربی بولتا تھا جیسے "حریری"[1] کا کوئی مقام پڑھ رہا ہو۔

اسی خط میں نہر سوئز کے متعلق لکھتے ہیں۔

"کسی شاعر کا قلم اور کسی سنگتراش کا ہنر اُس شخص کے تخیّل کی داد نہیں دے سکتا جس نے اقوامِ عالم میں اس تجارتی تغیّر کی بنیاد رکھی۔۔۔۔۔ یہ کینال جسے ایک فرانسیسی انجنیر نے تعمیر کیا تھا۔ دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے کینال کیا ہے، عرب اور افریقہ کی جدائی ہے اور مشرق اور مغرب کا اتحاد دنیا کی رومانی زندگی پر مہاتما بدھ نے بھی اس قدر اثر نہیں کیا، جس قدر اس مغربی اختراع[2] نے زمانہ حال کی تجارت پر کیا ہے"

سید غلام میران شاہ کو لکھتے ہیں:-

"حج بیت اللہ کی آرزو تو گزشتہ دو تین سال سے میرے دل میں بھی ہے خدا تعالیٰ ہر پہلو سے استطاعت[3] عطا فرمائے تو یہ آرزو پوری ہو۔ آپ رفیق ہوں تو مزید برکت کا باعث ہو۔۔۔ چند روز ہوئے۔ سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدر آباد کا خط مجھ کو ولایت سے آیا تھا جس میں وہ لکھتے ہیں کہ حج بیت اللہ اگر تمہاری معیت میں نصیب ہو تو بڑی خوشی کی بات ہے لیکن درویشوں کے قافلہ میں جو لذت و راحت ہے وہ امیروں کی معیت میں کیونکر نصیب ہو سکتی ہے" (دیباچہ مکاتیبِ اقبال حصّہ دوم)

مکاتیبِ اقبال سے مختصر سا تعارف کرانے کے بعد ہم اُن کے مکاتیب میں سے کسی قدر انتخاب کرتے ہیں۔

---

[1] مقامات حریری ایک کتاب ہے عربی میں [2] ایجاد [3] طاقت حیثیت۔

لاہور - ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۸ء

جناب مولانا گرامی مدظلہ العالی۔

گرامی کو خاک پنجاب جذب کرے گی یا خاکِ دکن؟ اس سوال کے جواب کے لیے حسب الحکم مراقبہ کیا گیا۔ جو انکشاف ہوا عرض کیا جاتا ہے گرامی مسلم ہے اور مسلم تو وہ خاک نہیں کہ خاک اُسے جذب کر سکے۔ یہ ایک قوتِ نورانیہ ہے، جو جامع ہے جواہر موسویت اور ابراہیمیت کی۔ آگ اسے چھو جائے تو برد و سلام بن جائے۔ پانی اس کی ہیبت سے خشک ہو جائے۔ آسمان و زمین میں یہ سما نہیں سکتی کہ یہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہیں۔ پانی آگ کو جذب کر لیتا ہے، عدم بود، کو کھا جاتا ہے، پستی بلندی میں سما جاتی ہے۔ مگر جو قوتِ جامع اضداد ہو اور محلّل تمام تناقضات کی ہو اسے کون جذب کرے۔ مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی قوّت حیات و موت کو اپنے اندر جذب کر کے حیات و ممات کا تناقض مٹا چکی ہے۔

شاید نفیر نام ایک شخص تھا۔ جو ہجرت سے پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سخت ایذا[1] دیتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جب حضورؐ شہر میں داخل ہوئے تو ایک مجمع عام میں آپؐ نے علی مرتضیٰ رضؓ کو حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دو۔ ذوالفقارِ حیدری نے ایک آن میں اس کمبخت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کی لاش خاک و خون میں تڑپ رہی تھی۔ لیکن وہ ہستی جس کی آنکھوں میں دوشیزہ[2] لڑکیوں سے بھی زیادہ حیا تھی، جس کا قلب تاثراتِ لطیفہ[3] کا سرچشمہ تھا اس دردانگیز منظر سے مطلق متاثر نہ ہوئی۔ نفیر کی بیٹی نے جب باپ کے قتل کی خبر سُنی تو نوحہ و فریاد کرتی اور باپ کی جدائی میں دردانگیز اشعار پڑھتی ہوئی دربارِ نبویؐ میں حاضر ہوئی۔ اللہ اکبر! اشعار سنے تو حضور اس قدر متاثر ہوئے کہ اس لڑکی کے ساتھ مل کر رونے لگے۔ یہاں تک کہ جوشِ ہمدردی نے اُس سب سے زیادہ ضبط کرنے والے انسان کے سینے سے ایک آہِ سرد نکلوا کر چھوڑی۔ پھر نفیر کی تڑپتی ہوئی لاش کی طرف

---

[1] تکلیف [2] کنواری [3] لطیف احساسات۔

اشارہ کر کے فرمایا۔ یہ فعل محمدؐ رسول اللہ کا ہے اور اپنی روتی ہوئی آنکھ پر انگلی رکھ کر کہا یہ فعل محمدؐ بن عبداللہ کا ہے پھر حکم دیا کہ تفسیر کے بعد کوئی شخص مکہ میں قتل نہ کیا جائے غرضیکہ اسی طرح مسلمِ حنیف[1] جذباتِ متناقض یعنی قہر و محبت اپنے قلب کی گرمی سے تحلیل کرتا ہے اور اس کا دائرہ اثرہ اخلاقی تناقضات تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام طبعی تناقضات پر بھی حاوی[2] ہے۔ پھر مسلم جو حامل ہے محمدیت کا اور وارث ہے موسویت وابراہیمیت کا، کیونکہ کسی "شے" میں جذب ہو سکتا ہے۔ البتہ اس زمان و مکان کی مقید دنیا کے مرکز میں ایک ریگستان ہے جو مسلم کو جذب کر سکتا ہے۔ اور اس کی قوتِ جاذبہ ذوقی اور فطری نہیں بلکہ مستعار[3] ہے ایک کفِ پا سے جس نے اس ریگستان کے چمکتے ذرّوں کو کبھی پامال کیا تھا۔

محمد اقبال

لاہور

یہ خط "مکاتیبِ اقبال بنام بلگرامی" سے لیا گیا ہے۔

"منشی سراج الدین کے نام"

(۲) لاہور۔ ۴ اکتوبر ۱۹۱۰ء

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ملا جس کو پڑھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی الحمد للہ آپ کو مثنوی پسند آئی۔ آپ ہندوستان کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کو شاعری سے طبعی مناسبت ہے اور اگر نیچر ذرا فیاضی سے کام لیتی تو آپ کو زمرۂ شعرا میں پیدا کرتی۔ بہر حال شعر کا صحیح ذوق شاعری سے کم نہیں۔ بلکہ کم از کم ایک اعتبار سے اس سے

---

[1] ۔ دین میں سچا اور مستحکم، جو باطل سے منہ موڑ کر حق کی طرف متوجہ رہے جو ملتِ ابراہیم پر قائم رہے [2] ۔ احاطہ کرنے والا، غالب، قابو پانے والا۔ [3] مانگا ہوا، ادھار لیا ہوا۔

بہتر ہے محض ذوقِ شعر رکھنے والا شعر کا ویسا ہی لطف اٹھا سکتا ہے جیسا کہ خود شاعر اور تصنیف کی شدید تکلیف اُسے اٹھانی نہیں پڑتی۔

یہ مثنوی گزشتہ دو سال کے عرصے میں لکھی گئی۔ مگر اس طرح کہ کئی کئی ماہ کے وقفوں کے بعد طبیعت مائل ہوتی رہی۔ چند اتوار کے دنوں اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے موجودہ مشاغل وقت نہیں چھوڑتے اور جوں جوں اس پروفیشن میں زمانہ زیادہ ہوتا جاتا ہے، کام بڑھتا ہی جاتا ہے۔ لٹریری مشاغل کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں۔ اگر مجھے پوری فرصت ہوتی تو غالباً اس موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔ اس کا دوسرا حصّہ بھی ہوتا جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حصّہ اس حصّے سے زیادہ لطیف ہوگا۔ کم از کم مطالب کے اعتبار سے۔ گو زبان اور تخیل کے اعتبار سے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہوگا۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے۔ جو اپنے اختیار کی بات نہیں . . . . .

آپ کا خادم
محمّد اقبال

---

(۳) سراج الدین پال کے نام

لاہور۔ ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء

مکرم بندہ۔ السلام علیکم۔

آپ کا خط مجھے مِل گیا۔ جس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ آپ کے مضامین نہایت اچھے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حقائق[1] السلامیہ کی سمجھ عطا کی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے

---

[1] حقیقتیں۔

دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ افسوس ہے، مسلمان مردہ ہیں۔ انحطاط[1] ملی نے ان کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے۔ اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید[2] پر ایسا اثر ڈالتا ہے، جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی[3] تصور کرنے لگتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔ مگر ہمیں اپنے ادائے فرض سے کام ہے۔ امت کا خوف رکھنا ہمارے مذہب میں حرام ہے میں مثنوی "اسرار خودی" کا دوسرا حصہ لکھ رہا ہوں، امید ہے کہ اس حصہ میں بعض باتوں پر مزید روشنی پڑے گی۔

حافظ پر ایک طویل مضمون شائع ہونے کا مجھے بھی احساس ہے مجھے یقین ہے کہ آپ اس کام کو باحسن[4] وجوہ انجام دے سکتے ہیں۔ آپ کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ جو سامانِ عقلی و اخلاقی، ایسا مضمون لکھنے کے لیے ضروری ہے، وہ سب آپ میں موجود ہے۔ . . . . . .

آپ کا مخلص

محمد اقبال

یہ اقتباس "اقبال نامہ" مجموعہ مکاتیبِ اقبال، حصہ اول سے لیا گیا ہے۔

---

(۴) علامہ سید سلیمان ندوی کے نام

لاہور ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء

مخدومی، السلام علیکم۔

نوازش نامہ ملا۔ عنوان کو آپ نے تجویز فرمایا ہے، ٹھیک ہے۔ تبصرہ کے متعلق میں بھی یہی مشورہ دوں گا کہ میرا مجموعہ شائع ہو لے تو لکھئے، فی الحال میں ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں جس کا تقریباً نصف حصہ لکھا جا چکا ہے کچھ نظمیں فارسی میں ہوں گی کچھ اردو میں کلام کا بہت سا حصہ نظرِ ثانی کا محتاج ہے، لیکن اور مشاغل

---

[1] قوی تنزل [2] شکار [3] سرپرست [4] نہایت خوبی کے ساتھ [5] دوبار دیکھنا۔

اتنی فرصت نہیں چھوڑتے کہ اِدھر توجہ کر سکوں ۔ تاہم جو کچھ ممکن ہے ، کرتا ہوں ، شاعری میں لیڑیچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح[1] نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں ، مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو ، اور بس اس بات کو مدِّنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ، ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں ، کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصوّر نہ کریں ۔ اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لیے ممکن نہیں۔ جرمنی کے دو بڑے شاعر بیرسٹر تھے یعنی گوئٹے اور روہلنڈ ۔ گوئٹے تھوڑے دن پریکٹس کے بعد ویمر کی ریاست کا تعلیمی مشیر بن گیا اور اس طرح فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کا اسے پورا موقع مِل گیا ۔ روہلنڈ تمام عمر مقدّمات پر بحث کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑی نظمیں لکھ سکا اور وہ کمال پورے طور پر نشو و نما نہ پا سکا جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا ۔ غرض یہ کہ موجودہ حالات میں میرے افکار اس قابل نہیں کہ ان کی تنقید کے لیے سیّد سلیمان کا دل و دماغ صرف ہو ۔ لیکن اگر احباب تبصرے پر مصر ہیں تو یہی بہتر ہے کہ مجموعے کا انتظار کیا جائے ۔ اس کے علاوہ میں اپنے دل و دماغ کی سرگذشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں اور یہ سرگذشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لیے نہایت ضروری ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں ، اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہو گا ۔

زیادہ کیا عرض کروں امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا ۔ والسّلام

مخلص ،

محمّد اقبال

(اقبال نامہ ۔ مجموعہ مکاتیبِ اقبال حصّہ اول)

---

[1] ۔ مقصدِ اصلی ۔

(۵) مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام

لاہور ۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء

(۲) اعتراض کا جواب آسان ہے۔ دین اسلام، جو ہر مسلمان کے عقیدہ کی رو سے، ہر شے پر مقدم ہے، نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا، بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود متعین[1] کرتا ہے ان حدود کے متعین کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے ، خودی خواہ مسولینی کی ہو، خواہ ہٹلر کی قانون الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض[2] کی تسکین کے لیے پامال کیا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں۔ دوسری صورت میں قانون الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے۔ بہرحال حدود خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔۔۔۔۔

(۳) معترض کا یہ کہنا کہ اقبال دورِ ترقی میں جنگ کا حامی ہے، غلط ہے، میں جنگ کا حامی نہیں ہوں، نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدودِ معینہ[3] کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کی رُو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں۔ محافظانہ اور مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جب کہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے، مسلمان کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے (نہ کہ حکم) دوسری صورت جس میں جہاد کا حکم ہے ۹ : ۴۹ میں بیان ہوئی ہے۔ ان آیات کو غور سے پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ چیز جس کو سیموئل ہو جمعیتِ اقوام کے اجلاس میں Collective Security کہتا ہے، قرآن نے اس کا اصول کس سادگی اور فصاحت سے بیان کیا ہے۔ اگر گزشتہ زمانے کے مسلمان مدبرین اور سیاسیین قرآن پر تدبر کرتے تو اسلامی دنیا میں جمعیت اقوام بنے ہوئے آج صدیاں گزر گئی ہوتیں

---

[1] ۔ مقرر ۔

[2] ۔ زمین کی بھوک، ملک گیری کی ہوس [3] مقررہ حدود

جنگ کی مذکورہ بالا دو صورتوں کے سوائے میں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا ۔ جرع الارض کی تسکین کے لیے جنگ کرنا دین اسلام میں حرام ہے ۔ علی ہذا القیاس[1] دین کی اشاعت کے لیے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(اقبال نامہ، مجموعہ مکاتیبِ اقبال ۔ حصّہ اول)

---

(۶) مخدوم الملک سید غلام میران شاہ کے نام

جاوید منزل لاہور

۲۹ مارچ ۱۹۳۸ء

مخدوم الملک جناب قبلہ پیر صاحب ۔ السّلام علیکم ۔

میں نے آپ کے مخلص کا خط پڑھا ہے ۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کے احباب اور مخلصین آپ سے اس روحانیت کی بنا پر جو آپ نے اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں پائی ہے، بہت بڑی بڑی امیدیں رکھتے ہیں ۔ ان امیدوں میں، میں بھی شریک ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ آپ کو اس امر کی توفیق دے کہ آپ اپنی قوت، ہمت، اثر و رسوخ اور دولت و عظمت کو حقائقِ اسلام کی نشر و اشاعت میں صرف کریں ۔ اس تاریک زمانے میں حضور رسالت مآب ؐ کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے ۔ کچھ عجب نہیں کہ جلد آپ کی طبیعت میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا ہو، جس کی ابھی تک آپ کو توقع نہیں ۔ افسوس ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان میں جن بزرگوں نے عَلَم اسلام بلند کیا اُن کی اولاد دین دینوی جاہ و منصب کے پیچھے پڑ کر تباہ ہو گئیں ۔ اور آج اُن سے زیادہ جاہل کوئی مسلمان مشکل سے ملے گا ۔ الا ماشاء اللہ ۔ وقت تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ انہیں بزرگوں کی اولاد میں سے کسی کی روحانیت کو بیدار کر دے ۔ اور کلمۂ اسلام کے اعلاء[2] پر مامور کر دے ۔ والسلام ۔

---

[1] اسی طرح [2] ۔ بلند کرنا ۔

(۷) حضرت علامہ مصطفٰے المراغی شیخ جامعہ ازہر کے نام

ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے کسی گاؤں میں ایک ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں وقوع[1] میں نہیں آئی۔ اس ادارے کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے دینی اور اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کر ہو۔ اور علومِ جدید کے چند فارغ التحصیل حضرات اور چند علوم دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں، یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجہ کی ذہنی صلاحتیں موجود ہوں اور وہ اپنی زندگیاں دین اسلام کی خدمت کے لیے وقف کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہم ان کے لیے تہذیب حاضرہ کے شور وشغب سے دور ایک ہوسٹل بھی بنانا چاہتے ہیں جو ان کے لیے ایک علمی اسلامی مرکز ہو۔ اور ان کے لیے ایک ایسی لائبریری بھی قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی کتاب موجود ہو۔ اور ان کی رہنمائی کے لیے ایسا معلّم جو کامل اور صالح ہو اور قرآن حکیم میں بصیرتِ تامّہ رکھتا ہو اور ساتھ ہی انقلاب دورِ حاضر سے بھی واقف ہو، مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح سے واقف کرے۔ اور تفکّر اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ وحکمت و اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں ان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعہ تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کرسکیں۔

اس تجویز کی اہمیت آپ پر ہم کیا ظاہر کریں۔ آپ خود اس بات کو بخوبی جانتے ہیں۔ لہذا میری خواہش ہے کہ آپ از راہ عنایت ایک روشن خیال مصری عالم کو جامعہ ازہر کے خرچ پر ہمارے پاس بھیج کر ممنون فرمائیں تاکہ وہ ہم کو اس کام میں مدد دے سکے یہ شخص علومِ شرعیہ اور تاریخ تمدنِ اسلامی میں ماہر ہو۔ نیز زبان، انگریزی پر بھی قدرت رکھتا ہو۔

مجھے توقع ہے کہ دینِ حق کا نور اس مرکز سے ہندوستان کے تمام اطراف

---

[1] ۔ظہور میں نہیں آئی۔

و اکناف میں پھیلے گا

محمّد اقبال

(نوٹ) یہ ایک خط کا اقتباس ہے اصل خط عربی میں لکھا گیا تھا۔
اقبال نامہ ۔ مجموعہ مکاتیبِ اقبال حصّہ اول

---

(۸) غازی عبدالرحمٰن کے نام

لاہور ۔ ۱۲ مئی ۱۹۱۶ء

مکرم بندہ تسلیم۔

نشانِ ہلال کی تاریخ میں اختلاف ہے ۔جہاں تک مجھے علم ہے یہ نشان نبی کریمؐ اور صحابہؓ کے عہد میں مروّج نہ تھا۔ بعض مغربی مورخین نے لکھا ہے کہ فتح قسطنطنیہ سے شروع ہوا بعض سلطان سلیم کے عہد میں بتاتے ہیں ۔ مگر یہ صحیح نہیں ۔میرے خیال میں ترکوں کو اس کی ترویج[1] سے کوئی تعلق نہیں ۔ غالباً صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں اس کی ترویج شروع ہوئی (صلیبی جنگوں کے تذکرے میں اس کا ذکر ملتا ہے) اور کچھ عجب نہیں کہ صلاح الدین ایوّبی کے زمانے سے اس کا آغاز ہوا ہو ۔صلاح الدین ایوّبی ترک نہ تھے ، کرد تھے سُنّی دنیا اس نشان کو اپنا قومی نشان تصوّر کرتی ہے ۔ایران کا نشان اور ہے ۔میرے خیال میں اس کا استعمال محض اتفاقی طور پر شروع ہوا ۔صلیبی سپاہی اپنے سینوں ، لباسوں اور علموں پر صلیب کا نشان رکھتے تھے ۔ امتیاز کے واسطے مسلمانوں نے یہ نشان شروع کیا ۔ اس واسطے کہ اس میں ہر روز بڑھنے[2] کا اشارہ تھا ۔ ہلال کا لفظ ہی نمو کا اشارہ کرتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں تاریخی پہلو سے میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے موجد نے اس نمو کے خیال سے جاری کیا یا چاند ، سورج سے اپنا سلسلۂ نسب ملانے کے خیال سے مگر تمام اُمّت کا اس پر

---

[1] ۔ روح دینا ۔ [2] بڑھنا ۔

صدیوں سے اجماع[1] ہو چکا ہے۔ جن اسلامی قوموں کا نشان اور ہے وہ اس نشان پر کبھی معترض نہیں ہوئے۔ اور حدیث صحیح ہے کہ میری امت کا اجماع ضلالت[2] پر نہ ہو گا۔ اس واسطے اس کو ضلالت تصور کرنا ٹھیک نہیں ہے واللہ اعلم۔

(اقبال نامہ مجموعہ مکاتیبِ اقبال حصہ اول)

محمد اقبال۔

لمعہ صاحب کے نام۔

سنئے غزل اور رباعی کے لیے قافیہ کی شرط تو لازمی ہے اگر ردیف بھی بڑھا دی جائے تو سخن میں اور لطف بڑھ جاتا ہے۔ البتہ نظم ردیف کی محتاج نہیں۔ قافیہ تو ہونا چاہیے۔

اب کچھ عرصہ سے بلا ردیف و قافیہ نظمیں لکھی جاتی ہیں اور یہ انگریزی نظموں کی تقلید ہے۔ جس کا نام انگریزی میں 'بلینک ورس' Blank Verse ہے جس کو (نثر مرجز) کہنا چاہیے، اگرچہ پبلک مذاق کچھ ایسا ہو چلا ہے، مگر میرے خیال میں یہ روش آئندہ مقبول نہ ہو گی۔ نظموں کے لیے اولاً سبجیکٹ (Subject) اور مضامین تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ نیچرل مضامین تو سبجیکٹ ہی کے اعلیٰ انتخاب سے کچھ لطف دیتے ہیں۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی نظمیں اس خصوصیت سے مالا مال ہوتی ہیں کلام کی پختگی تو اب بھی آپ کے خیالات میں موجود ہے اور مشق سے ہوتے ہوتے حاصل ہو گی۔ قدیم شاعری اور جدید شاعری کا سوال بھی سرمایۂ ادب کا ایک سبجیکٹ ہو گیا ہے۔

میں فقط فرسودہ مضامین کی حد تک جدید و قدیم کی بحث کو مانتا ہوں۔ شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں۔ جذباتِ انسانی اور کیفیاتِ قلبی اللہ کی دین ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ طبع موزوں اس کے ادا کرنے کے لیے پر اثر الفاظ کی تلاش کرے

---

[1] علماء کا کسی دینی بات پر متفق ہونا۔ [2] گمراہی

نظم کے اصناف[1] کی تقسیم جو قدیم سے ہے، ہمیشہ رہے گی اور انسانی جذبات ماحول کے تابع رہیں گے۔ بس یہ سمجھ لیا جائے کہ جس شاعر کے جذبات ماحول سے اثر پذیر ہیں وہ شاعر جدید رنگ کا حامل متصور ہو سکتا ہے نہ کہ نفسِ شعری! اگر ہم نے پابندیِ عروض کی خلاف ورزی کی تو شاعری کا قلعہ ہی منہدم ہو جائے گا۔ اور اس نقطۂ خیال سے یہ کہنا پڑے گا اور یہ کہنا درست ہے کہ موجودہ شعراء کا کام تعمیری ہونا چاہیے نہ کہ تخریبی
خدا حافظ۔ زیادہ والسلام

مخلص محمد اقبال
۱۰ اپریل ۱۹۳۴ء

حافظ محمد فضل الرحمٰن انصاری کے نام

لاہور۔ ۱۶ جولائی ۱۹۳۷ء

جناب من۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے، فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی کی، یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں جن کو عالمانہ تحقیق[2] اور حقائقِ حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے، سادہ لوح مسلمان طالب علم اس طلسم میں گرفتار ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں آپ کے بلند مقاصد پر نظر رکھتے ہوئے میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے لیے یورپ جانا بے سود ہے ؎

میر کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

مصر جائیے، عربی زبان میں مہارت پیدا کیجیے، اسلامی علوم، اسلام کی دینی اور سیاسی تاریخ، تصوف، فقہ، تفسیر کا بغور مطالعہ کر کے محمد عربیؐ کی اصل روح تک

---

[1] قسمیں [2] حق کی تحقیق کرنا۔

پہنچنے کی کوشش کیجیے ۔ پھر اگر ذہن خداداد ہے اور دل میں خدمت اسلام کی تڑپ ہے تو آپ اس تحریک کی بنیاد رکھ سکیں گے جو اس وقت آپ کے ذہن میں ہے ہاں یورپ کا فلسفہ پڑھنے کے لیے آپ یورپ کا سفر کر سکتے ہیں ۔ اگرچہ مسلمانوں کو موجودہ حالات میں فلسفہ اور لٹریچر کی چنداں ضرورت نہیں ۔ اس صورت میں بھی (Thesis) کے ذریعے ڈگری حاصل کرنا فضول ہے ۔ یورپ کے فلسفہ کی مختلف شاخوں کا مطالعہ کر کے ڈگری حاصل کرنا چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

والسّلام
محمد اقبال

(اقبالنامہ ، مجموعہ مکاتیبِ اقبال حصہ اول)

محمد علی جناح کے نام

لاہور ۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء

بصیغۂ راز ۔

مائی ڈیر مسٹر جناح ۔

نوازش نامہ موصول ہوا ، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔ یہ اطلاع کہ لیگ کے دستور و پروگرام میں جن تغیرات کی طرف میں نے آپ کی توجہ مبذول کرائی تھی وہ آپ کے پیش نظر رہیں گے ، موجب مسرت و اطمینان ہوئی ۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اسلامی ہند کی نزاکت حالات کا آپ کو پورا پورا احساس ہے ۔ لیگ کو انجام کار یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ وہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندہ بنی رہے یا مسلمان عوام کی نمائندگی کا حق ادا کرے جنہیں اب تک نہایت بجا طور پر لیگ میں کوئی وجۂ دل کشی نظر نہیں آئی ۔ میرا ذاتی خیال یہی ہے کوئی سیاسی جماعت جو عام مسلمانوں کی بہبود کی ضامن نہ ہو عوام کے لیے باعثِ کشش نہیں ہو سکتی ۔

نئے دستور کے ماتحت بڑی بڑی اسامیاں تو اعلیٰ طبقات کے بچوں کے لیے

وقف ہیں اور چھوٹی چھوٹی وزرار کے دوستوں اور رشتہ داروں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ دوسرے اعتبارات سے بھی ہمارے سیاسی ادارات نے غریب مسلمانوں کی اصلاح حال کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں کی۔

روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گزشتہ دو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے۔ مسلمان سمجھتے ہیں کہ ان کے افلاس کی ذمہ داری ہندو کی ساہوکاری و سرمایہ داری پر عائد ہوتی ہے لیکن یہ احساس کہ ان کے افلاس میں غیر ملکی حکومت بھی برابر کی حصہ دار ہے، اگرچہ ابھی قوی نہیں ہوا، لیکن یہ نظریہ بھی پوری قوت و شدت حاصل کر کے رہے گا۔

جواہر لال کی منکرِ خدا[1] اشتراکیت مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہ کر سکے گی۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو افلاس سے کیونکر نجات دلائی جا سکتی ہے؟ لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لیے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس[2] کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان عوام پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق رہیں گے۔

خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس مسئلہ کا حل موجود ہے اور فقہ اسلامی کا مطالعہ مقتضیاتِ حاضرہ کے پیش نظر دوسرے مسائل کا حل بھی پیش کر سکتا ہے۔

شریعت اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ کسی ایک آزاد اسلامی ریاست یا ایسی چند ریاستوں کی عدم موجودگی میں شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ اس

---

[1] ۔ خدا کا انکار کرنے والی [2] ۔ غریبی، مفلسی، محتاجی

ملک میں محال ہے۔ سالہا سال سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے اور میں اب بھی اسے ہی مسلمانوں کے افلاس اور ہندوستان کے امن کا بہترین حل سمجھتا ہوں۔ اگر ہندوستان میں اس طریقہ کار پر عملدرآمد اور اس مقصد کا حصول ناممکن ہے تو پھر صرف ایک ہی راہ رہ جاتی ہے اور وہ خانہ جنگی ہے۔ جو فی الحقیقت ہندو مسلم فسادات کی شکل میں کئی سالوں سے شروع ہے ..... مسائل حاضرہ کا حل مسلمانوں کے لیے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ لیکن جیسا اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ اسلامی ہندوستان میں ان مسائل کے حل بآسانی رائج کرنے کے لیے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد ضروری ہے۔ کیا آپ کی رائے میں اس مطالبہ کا وقت نہیں آن پہنچا؟ شاید جواہر لال کی بے دین اشتراکیت کا آپ کے پاس یہ بہترین جواب ہے۔

بہرحال میں نے اپنے خیالات آپ کی خدمت میں اس امید سے پیش کر دیے ہیں کہ آپ ان پر اپنے خطبہ یا لیگ کے آئندہ اجلاس کے مباحث میں پوری پوری توجہ مبذول کر سکیں۔

اسلامی ہندوستان کو امید ہے کہ اس نازک دور میں آپ کی فطانت و فراست ان کی موجودہ مشکلات کا کوئی حل تجویز کر سکے گی۔

مخلص

محمد اقبال

(اقبالنامہ: مجموعۂ مکاتیبِ اقبال۔ حصہ دوم)

لاہور

۲۱ جون ۱۹۳۷ء

بصیغۂ راز۔ مائی ڈیئر مسٹر جناح

نوازش نامہ کل موصول ہوا۔ جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ کی

۵۹

بے پناہ[1] مصروفیت کی آگاہی رکھنے کے باوجود آپ کو اکثر لکھتے رہنے کے لیے معذرت خواہ ہوں، اس وقت مسلمانوں کو اس طوفانِ بلا میں جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید ملک کے گوشہ گوشہ سے اٹھنے والا ہے، صرف آپ ہی کی ذاتِ گرامی سے رہنمائی کی توقع ہے۔ میں سمجھتا ہوں ہم فی الحقیقت خانہ جنگی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ فوج اور پولیس موجود نہ ہو تو یہ خانہ جنگی چشم زدن[2] میں عالمگیر ہو جائے۔ گذشتہ چند ماہ سے ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ صرف شمال مغربی ہند میں ان تین ماہ میں کم از کم تین فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے توہینِ رسولؐ کی کم از کم چار وارداتیں پیش آ چکی ہیں۔ توہینِ رسولؐ کی ان چار وارداتوں میں مجرم فی النار[3] کر دیا گیا۔ سندھ میں قرآن کریم کے نذرِ آتش کرنے کے واقعات بھی پیش آئے ہیں۔ صورتِ حال کا نظرِ غائر[4] سے مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان حالات کے اسباب نہ مذہبی ہیں نہ معاشی بلکہ خالص سیاسی ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں بھی ہندو اور سکھوں کا مقصد مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری کر دینا ہے۔ آئین کی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ اپنی اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلمانوں کا دار و مدار تمام تر غیر مسلموں پر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم وزارت نہ صرف کوئی مناسب کاروائی نہیں کر سکتی بلکہ وزارت کو خود مسلمانوں سے ناانصافی برتنی پڑتی ہے۔ تاکہ وہ لوگ جن کی امداد پر وزارت قائم ہے، خوش رہ سکیں اور دوسروں پر ظاہر کیا جا سکے کہ وزارت قطعی طور پر غیر متعصب[5] ہے۔ لہٰذا یہ ایک عالم آشکار حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے پاس اس آئین کو رد کرنے کی خاص وجوہ موجود ہیں مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ دستورِ جدید ہندوؤں ہی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ ان صوبوں میں جہاں ہندو آبادی کی اکثریت ہے، حکومت میں ہندوؤں کو قطعی اکثریت حاصل ہے۔ اور وہ مسلمانوں کو بالکل نظر انداز کر سکتے ہیں۔ بر خلاف

۱۔ انتہا درجہ کی ۲۔ پلک جھپکنے، ذرا سی دیر میں ۳۔ ہلاک ۴۔ گہری نظر ۵۔ بے تعصب غیر جانبدار۔

اس کے مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو ہندوؤں کا دست نگر رکھا گیا ہے ۔
مجھے اس امر میں قطعاً ذرا برابر شک و شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ موجودہ دستورِ ہندی مسلمانوں کے لیے زہرِ قاتل کا حکم رکھتا ہے ۔ مزید براں یہ دستور تو اس معاشی تنگ دستی کا جو شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے ، کوئی علاج ہی نہیں ۔ قرۃ وارانہ فیصلہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی ہستی کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن کسی قوم کی سیاسی ہستی کا ایسا اعتراف جو اس کی معاشی پس ماندگی کا کوئی حل نہ تجویز کرتا ہو اور نہ کر سکے اس کے لیے بے سود ہے ۔ . . . . . .

اندریں حالات یہ بالکل عیاں[1] ہے کہ ہندوستان کا امن نسلی ، مذہبی اور لسانی میلانات کی بنا پر ملک کی تقسیمِ مکرر پر موقوف ہے ۔ اکثر برطانوی مدبر بھی اس نظریے کے قائل ہیں ۔ ہندو مسلم فسادات جو اس دستورِ جدید کے جلو میں پوری تیزی سے رونما ہو رہے ہیں ، امید ہے ان پر یہ حقیقت ناقابلِ تردید طور پر واضح کر دیں گے ۔
مجھے یاد ہے انگلستان سے میری روانگی کے وقت لارڈ لوئین نے مجھ سے کہا تھا کہ ہندوستان کی مشکلات کا حل تو تمہاری اسکیم میں موجود ہے لیکن اس کے بارآور ہونے کے لیے پچیس سال کی مدّت درکار ہو گی ۔ پنجاب کے بعض مسلمان تو پہلے ہی شمال مغربی ہند کی ایک مسلم کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پر غور کر رہے ہیں ۔ اور یہ خیال پھیلتا جا رہا ہے ۔

اس امر میں ، میں آپ کا ہم خیال ہوں کہ ہماری قوم ابھی تک نظم و ضبط[2] سے محروم ہے ۔ اور شاید ایسی کانفرنس کے انعقاد کے لیے ابھی وقت سازگار نہیں ۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبہ میں کم از کم اس طریقِ عمل کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہیے جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو انجام کار مجبوراً اختیار کرنا ہی پڑے گا ۔

---

[1] ظاہر ۔ [2] باقاعدگی ۔

میرے خیال میں تو "دستورِ جدید" سارے ہندوستان کو ایک ہی وفاق میں مربوط کر لینے کی تجویز کی بنا پر حد درجہ یاس انگیز ہے۔

مخلص محمد اقبال

(اقبال نامہ - مجموعہ اقبال حصہ دوم)

لسان العصر اکبرؔ الٰہ آبادی کے نام

لاہور - ۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء

مخدوم و مکرم جناب قبلہ سید صاحب - السّلام علیکم

کل ظفر علی خاں سے سُنا تھا کہ جناب کو چوٹ آگئی ہے اسی وقت سے میرا دل بے قرار تھا اور عریضہ خدمتِ عالی میں لکھنے کو تھا کہ آج جناب کا محبت نامہ مِلا۔ دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس تکلیف کو رفع کرے اور آپ کو دیر تک زندہ رکھے تاکہ ہندوستان کے مسلمان اس قلب کی گرمی سے متاثر ہوتے رہیں، جو خدا نے آپ کے سینے میں رکھی ہے۔

میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہو - اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جاسکے۔

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سے مشکل راز داں کے واسطے

لارڈ بیکن کہتے ہیں "جتنا بڑا شہر ہو اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے" سو یہی حال میرا لاہور میں ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ ماہ بعض معاملات کی وجہ سے سخت پریشانی رہی اور مجھے بعض کام اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف کرنے پڑے۔ اور ان ہی

میں طبع سلیم میرے لیے شکنجے کا کام دے گی۔ . . . . . .

دعا گو

محمد اقبال بیرسٹر

لاہور

(اقبالنامہ، مجموعہ مکاتیب اقبال حصہ دوم)

قاضی نذیر احمد کے نام

لاہور۔ ۱۲ مئی ۱۹۳۷ء

(خط میں بعض جواب طلب امور کا جواب دینے کے بعد ایک سوال کا جواب یہ دیتے ہیں)

دوسرے سوال کا جواب بہت طویل ہے۔ مگر افسوس کہ طویل خط لکھنے کی نہ ہمت ہے نہ خواہش۔ مختصراً یہ عرض ہے کہ عصبیت اور چیز ہے اور تعصب اور چیز ہے عصبیت کی جڑ حیاتی (Biological) ہے اور تعصب کی نفسیاتی (Psycho-logical)۔ تعصب ایک بیماری ہے جس کا علاج اطبائے روحانی اور تعلیم سے ہو سکتا ہے۔ عصبیت زندگی کا ایک خاصہ ہے جس کی پرورش اور تربیت ضروری ہے۔ اسلام میں انفرادی اور اجتماعی عصبیت دونوں کے حدود مقرر ہیں، انہی کا نام شریعت ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے بلکہ ہر مسلمان کے عقیدہ کی رو سے، ان حدود کے اندر رہنا باعث فلاح ہے اور ان سے تجاوز کرنا بربادی۔ تصادم[1] جس کا آپ نے ذکر کیا ہے صرف اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جبکہ ان حدود سے تجاوز کیا جائے۔ یا اپنی عصبیت کو چھوڑ کر کوئی دوسری عصبیت مثلاً نسلی عصبیت اختیار کر لی جائے اگر کوئی شخص کہے کہ کفار کے ساتھ ہر قسم کا میل میلاپ حرام ہے تو وہ حدود شرعیہ

---

[1] باہم ٹکرانا۔ لڑنا

سے تجاوز کرتا ہے اور اس کے لیے تبلیغ دین میں دقتوں کا سامنا ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی قوم اسلامی عصبیت کو چھوڑ کر نسلی عصبیت کو بطور ایک اصولِ تنظیم کے اختیار کرے مثلاً ترکوں پر یہ خیال غالب آرہا ہے تو اس قوم کے لیے تبلیغ بے معنی ہو جاتی ہے۔ اور اس کو یوں بھی تبلیغ میں دلچسپی نہ رہے گی۔ والسّلام

ازقلم محمّد شفیع ایم اے

(اقبالنامہ مجموعہ مکاتیبِ اقبال حصّہ دوم)

حصّہ نظم

فہرست مضامین

حصّہ نظم

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	اقبال کی شاعری	۶۹
	انتخاب نظم	
۱۔	غزلیات	۸۵
۲۔	قطعات و رباعیات	۹۳
۳۔	منظومات	۹۷
۴۔	اقبال کے محبوب الفاظ	۱۲۷

نوٹ: حصہ نظم ۔ نمبر ۲ سے ۱۸ تک بانگِ درا سے لیا گیا ہے۔ نمبر ۱۹ "مردِ مومن" ضربِ کلیم سے اور نمبر ۲۰ بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو ارمغانِ حجاز حصّہ اردو سے۔

اقبال کی شاعری

اقبال کی اُردو شاعری کی ابتدا سیالکوٹ میں اُس وقت ہو گئی تھی جب کہ وہ ابھی اسکول ہی میں پڑھتے تھے۔ لیکن شاعری کے جوہر لاہور آنے پر چمکے۔ شروع میں ان کی شاعری کا چرچا اُن کے ہم جماعت طلبا، احباب اور اساتذہ تک محدود تھا لیکن بہت جلد اُن کے شاعرانہ کمال کا آوازہ[1] طلبا اور احباب کے حلقہ سے نکل کر دور دور جا پہنچا لاہور کے مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ اول مرزا ارشد گورگانی دہلوی سے اصلاح کلام کے لیے رجوع کیا۔ پھر مرزا داغ دہلوی سے، جو اُن دنوں حیدرآباد دکن میں تھے بذریعہ خط و کتابت تلمذ[2] اختیار کیا اور چند غزلیں اصلاح کے لیے روانہ کیں۔ سر عبدالقادر فرماتے ہیں:-

"اس طرح اقبال کو اردو زباں دانی کے لیے بھی ایسے اُستاد سے نسبت پیدا ہوئی جو اپنے وقت میں زبان کی خوبی کے لحاظ سے فنِ غزل گوئی میں یکتا سمجھا جاتا تھا۔ گو اس ابتدائی غزل گوئی میں وہ باتیں تو موجود نہیں تھیں، جن سے بعد ازاں کلام اقبال نے شہرت پائی۔ مگر جناب داغ پہچان گئے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع کا یہ طالب علم کوئی معمولی غزل گو نہیں۔ انہوں نے جلد کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے اور یہ سلسلۂ تلمذ کا بہت دیر قائم نہیں رہا۔ البتہ اس کی یاد دونوں طرف رہ گئی۔ داغ کا نام اُردو شاعری میں ایسا پایہ رکھتا ہے کہ اقبال کے دل میں داغ سے اس مختصر اور غائبانہ تعلق کی بھی قدر ہے اور اقبال نے داغ کی زندگی ہی میں قبول عام کا وہ درجہ حاصل کر

---

[1] شہرت [2] شاگردی

لیا تھا کہ داغؔ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی اُن لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام کی انہوں نے اصلاح کی۔ مجھے خود دکن میں اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سنے۔

(مقدمہ بانگِ درا)

اقبال کی اسی زمانے کی ایک غزل کا مقطع ہے جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان کے دل میں داغ کے ساتھ اس مختصر اور غائبانہ تعلق کی کیسی قدر تھی :۔

نسیمؔ و تشنہؔ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں کا

داغؔ کی وفات پر مرثیہ بھی لکھا جس میں داغ کی خصوصیاتِ کلام کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے اور جتنے مرثیے انہوں نے لکھے ہیں، ان سب میں، یہی ایک مرثیہ ایسا ہے جس میں مرثیہ کی شان بدرجہ اتم موجود ہے۔ داغ کے کلام کی خصوصیات بیان کرتے ہیں :۔

اب کہاں وہ بانکپن[1]! وہ شوخیِ طرزِ بیاں
آگ تھی کافورِ[2] پیری میں، جوانی کی نہاں
تھی زبانِ داغ پر، جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٰ معنی وہاں بے پردہ، یاں محمل[3] میں ہے
اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ[4] گل کا راز؟
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز؟
تھی حقیقت سے نہ غفلت، فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

---

[1] شوخی کا انداز [2] بڑھاپے کی ٹھنڈک، [3] اونٹ کا ہودہ کجاوہ [4] خاموشی

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں
اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں
تلخیٔ دوراں کے نقشے کھینچ کر دُلوائیں گے
یا تخیّل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے
اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز[1] بھی
سیکڑوں[2] ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز[3] بھی
اٹھیں گے آذر[4] ہزاروں، شعر کے بتخانے سے
مے پلائیں گے نئے ساقی، نئے پیمانے سے
لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی! تیری تعبیریں بہت
ہو بہو کھینچے گا لیکن، عشق کی تصویر کون؟
اُٹھ گیا ناوک[5] فگن، مارے گا دل پر تیر کون؟

اقبال نے لاہور کے مشاعرے میں سب پہلے جو غزل پڑھی تھی اس کا مقطع یہ ہے

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے، ہے غرض
ہم تو اسیر[6] ہیں، خمِ زلفِ کمال کے

اگر تحقیق کی نظر سے واقعات کو دیکھا جائے تو یہ شعر اُن کی افتادِ طبع کا صحیح ترجمان ثابت ہوگا۔ اُس وقت زبان، اندازِ بیان، تاثیر اور قادر الکلامی کے اعتبار سے داغ ہی کو قبولِ عام کے دربار میں صدر نشینی کا منصب حاصل تھا۔ اس لیے اقبال کی کمال پسند طبیعت نے اُن کا انتخاب کرلیا۔ اور اس انتخاب کے وقت لکھنؤ اور دلی کا تصوّر اُن کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔

---

[1] حافظ شیراز جیسے شاعر [2] جادوگر [3] معجز بیان [4] حضرت ابراہیم کے والد [5] تیر چلانے والا۔ [6] گرفتار۔

اسی طرح ارادی و غیر ارادی طور پر زبان اور اندازِ بیان میں وہ ہمیشہ مرزا غالب کی پیروی کرتے رہے، وہی فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی کثرت، وہی رفعتِ فکر و بلندیِ تخیل، جو مرزا کے کلام کا جوہر ہے، اقبال کے ہاں بھی موجود ہے اور اسی وجہ سے مرزا غالب کی یاد میں بھی انہوں نے کچھ اشعار لکھے ہیں جن میں مرزا کی ان خصوصیات ہی کی تعریف کی ہے۔ مثلاً

فکرِ انساں پر تری ہستی سے، یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا[1]
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر[2] ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو، اُس حسن کو منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور[3] ہے
محفلِ ہستی ترے بربط[4] سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندّی کے نغموں سے، سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے، قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ[5] وار
زندگی مضمر[6] ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے، لبِ تصویر میں
نطق[7] کو سو ناز ہیں، تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدّق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّیِ گلِ شیراز پر

---

[1] پہنچ [2] کہاں تک [3] جسم [4] پوشیدہ [5] باجا [6] سبزہ کی طرح [7] پوشیدہ [8] گویائی، بولنے کی قوت

آہ ! تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر[1] میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری[2] ہی ممکن نہیں
ہو تخیّل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

اور جس طرح زبان و بیان کے معاملے میں انہوں نے داغ اور غالب کا انتخاب کیا تھا۔ معانی و مضامین کے لیے ان کی نظر مولانا الطاف حسین حالی پر پڑی۔ قوم کا درد قومی روایات کے ساتھ والہانہ[3] تعلق، قوم کی اخلاقی پستی کا رونا، جو حالی کے کلام کی جان ہے، کلامِ اقبال کی تاثیر کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ اگرچہ اُن میں اور حالی میں بڑا فرق ہے۔ حالی کے یہاں یاس[4] ہے مگر اقبال کے یہاں امید کا دامن کسی وقت بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ حالی کے ہاں قوم اور وطن کا درد ہے مگر اقبال کے یہاں اسلام پوری ملّت اسلامیہ اور اس سے بھی سوا تمام بنی نوعِ انسان کا درد ہے اور پھر جو تنوّع[5] مضامین اقبال کے ہاں پایا جاتا ہے، اس کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ تاہم سوز و دردِ قوم وہی ہے جس نے حالی سے مسدس لکھوایا تھا۔ اگرچہ یہ سوز و گداز بھی اقبال کے ہاں انتہائی کمال کو پہنچ گیا ہے یہاں تک کہ اس کی نظیر پوری شاعری کیا، فارسی شاعری میں بھی مشکل ہی سے مل سکے گی اور ان کی کمال پسندی کی انتہا ہے کہ اپنی کتاب "بالِ جبریل" کے سرنامے کو بھرتری ہری کے ایک شعر کے ترجمے سے مزیّن کیا وہ شعر یہ ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے، ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

بہرحال ایسا شاعر جو ایک عالمگیر پیغام لے کر آیا ہو، کسی خاص مقام میں محدود

---

[1] جرمنی کا ایک شہر [2] برابری [3] انتہائی شوق و محبت والا [4] ناامیدی [5] رنگا رنگی۔

ہونا کیسے پسند کر سکتا۔ اس لیے اقبال کی آزاد طبیعت نے دلی اور لکھنؤ کی قید سے نکل کر ایک نئی دنیائے شاعری پیدا کی اور اپنے زندگی بخش نغمات سے اس عالمگیر ملّت کے جسم مُردہ میں خون زندگی دوڑا دیا۔

بیس[1] بائیس سال کی عمر میں ایک غزل مشاعرے میں پڑھی جب اس شعر پہ پہنچے۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے، مرے عرقِ انفعال[1] کے

تو مرزا ارشد گورگانی مرحوم نے اختیار سبحان اللہ اور واہ واہ کہہ اٹھے اور بولے .... میاں اقبال اس عمر میں اور یہ شعر!

یہ پہلا موقعہ تھا کہ لاہور کے باذاق اور سخن فہم لوگوں کو اس جوہر قابل کا علم ہوا اور دیکھنے والوں نے ذرّے میں آفتاب کی تابانی اور قطرے میں دریا کی روانی کا مشاہدہ کر لیا تھا۔ لیکن اقبال غزل کے لیے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے غزل کو خیرباد کہہ کر بہت جلد جو کام کرنا تھا اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ قوم کی حالت خراب تھی۔ اس پہ دل دُکھا اور درد انگیز نغمے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ شعر کیا تھے، شیشۂ بشکستہ کی، آواز تھی اگر ایک طرف ملک کا سب سے زیادہ موقر[2] مجلّہ، مخزن، جو شیخ عبدالقادر مرحوم نے جاری کیا تھا ان کے کلام سے آراستہ ہونے لگا تو دوسری طرف ملک کی سب سے زیادہ مقبول، انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے کی یہ خصوصیت قرار پا گئی کہ اس میں اقبال اپنی نظم سنائیں گے۔ غرضیکہ ایسے پریس اور ایسے پلیٹ فارم سے اُن کا پیغام بلند ہوا اور ملک کے گوشے گوشے میں پہنچنے لگا۔

مخزن کے پہلے ہی شمارے کو جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا تھا، اقبال کی نظم "ہمالیہ" شائع کرنے کا شرف حاصل ہوا اور پھر ۱۹۰۵ء تک، جب کہ وہ ولایت تشریف نہ لے گئے یہ سلسلہ برابر جاری رہا یعنی مخزن کے ہر شمارے میں ان کی تازہ نظم ضرور

---

[1] ۔ شرم کا پسینہ [2] معزز رسالہ۔

شامل ہوئی۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں کا کیا کہنا! جب اقبال کی نظم پڑھی جاتی تو دس دس ہزار آدمی بیک وقت جمع ہوتے اور دم بخود بیٹھے سنتے رہتے۔ ایک اجلاس میں، اقبال نے "نالۂ یتیم" کے نام سے نظم پڑھی تو ایک کہرام مچ گیا۔ گویا جلسہ گاہ صفِ ماتم بن گئی تھی۔ ہر شخص کی آنکھیں اشکبار تھیں اور دل غم میں ڈوبا ہوا تھا۔

شیخ عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں:۔

"انجمن کا ایک اجلاس جس میں اقبال نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" اپنے خاص انداز میں پڑھی اکثر لوگوں کو یاد ہوگا کہ کیفِ غم[1] کا سماں جلسے پر چھا گیا تھا۔ ان کے بہت سے مدّاح[2] پھولوں سے جھولیاں بھر کر لائے تھے اور جب وہ پڑھ رہے تھے تو ان پر پھول برسا رہے تھے۔

اسی طرح جب ایک اور اجلاس میں انہوں نے اپنی نظم "خضرِ راہ" سنائی تو مجمعے پر جو درد انگیز اثر ہوا قابلِ بیان ہے۔ اس شعر پر پہنچے تو خود بھی رونے لگے اور حاضرین کو بھی رلایا۔

بیچتا ہے ہاشمی[3] ناموسِ[4] دینِ مصطفٰےؐ
خاک و خوں میں لوٹتا ہے ترکمانِ سخت کوش[5]

"خضرِ راہ" کے بعد دوسرے سال انہوں نے اپنے اس دورِ شاعری کی شاہکار[6] نظم "طلوعِ اسلام" بھی انجمن کے سالانہ جلسہ ہی میں سنائی تھی۔ غرض انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں کی بدولت ملتِ اسلامیہ ہند[7] کو گراں بہا، غیر فانی دولت حاصل ہوئی۔ جس سے ملت کا سر افتخار سے ہمیشہ بلند رہے گا۔

اس زمانے میں ان کی آمدِ شعر کے بارے میں سر عبدالقادر فرماتے ہیں کہ:۔

اقبال اس وقت طالب علمی سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو گئے تھے اور دن رات علمی صحبتوں اور مشاغل میں بسر کرتے تھے۔ طبیعت زوروں پر تھی۔ شعر

۱۔ غم کی کیفیت ۲۔ تعریف کرنے والے ۳۔ شریفِ مکہ مراد ہے ۴۔ عزت
۵۔ سخت محنت کرنے والا ترک۔ ۶۔ سب سے بڑا کارنامہ ۷۔ موجودہ برصغیر ہند و پاک

کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی۔ ایک نشست میں بے شمار شعر ہو جاتے تھے۔ ان کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دھن میں کہتے جاتے۔ میں نے اُس زمانے میں انہیں کبھی کاغذ لے کر فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا۔ موزوں الفاظ کا دریا تھا یا ایک چشمہ اُبلتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک خاص کیفیت رِقت[1] کی عموماً ان پر طاری ہوتی تھی۔ اپنے اشعار سُریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے خود وجد کرتے اور دوسروں کو بھی وجد[2] میں لاتے تھے۔

اقبال کی شاعری کو چار دوروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور، شعر گوئی کے آغاز سے ۱۹۰۵ء تک ہے، یعنی ان کے انگلستان جانے سے پہلے کا زمانہ۔ دوسرا دور، ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک ہے جب کہ وہ حصول تعلیم کے لیے انگلستان میں رہے۔ تیسرا دور ۱۹۰۹ء سے بانگِ درا کی اشاعت (۱۹۲۴ء) تک ہے اور چوتھا دور، ۱۹۲۴ء سے وفات تک ہے

ان ادوار[3] کی شاعری میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے مگر یہ اختلاف ویسا ہی ہے جیسا کسی چیز میں ارتقائی[4] مدارج طے کرتے وقت مختلف ادوار میں ہوتا ہے اور ایسا اختلاف ناگزیر ہے۔ ورنہ جمود[5] لازم آتا ہے جو زندگی کے منافی ہے۔ اس اختلافِ احوال سے نہ فرد کو مفر ہے نہ قوم کو۔ جوں جوں خیالات میں تبدیلی اور نظریات میں وسعت آتی جاتی ہے افعال و کردار میں بھی اس کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ تاہم اقبال کی طبیعت کا جوہر یعنی قوم و ملّت کا درد، اسلام سے محبت ہے عشقِ رسولؐ اور اسلام کا عشق شروع سے آخر تک قائم رہا۔ بلکہ شروع میں ایک شرار تھا تو آخر میں برقِ سوزاں بن کر ان کے رگ و پے میں رواں دواں ہو گیا۔ اور وہی نظریات جو شروع میں بہت کم نمایاں تھے بعد میں وسعت و پختگی حاصل کر کے اپنی تابانی سے دنیا کی نگاہوں

---

[1] ۔ درد و سوز و گداز [2] جھومنا [3] دور کی جمع ہے [4] ترقی کی منزلیں
[5] ۔ بے عملی ۔

کو خیرہ[1] کرنے لگے

دَورِ اوّل :-

(۱) کسی قدر داغؔ کے رنگ کی غزلیں ہیں جو زبان اور اندازِ بیان، ہر اعتبار سے داغؔ کے رنگ کا بہترین نمونہ ہیں۔ تعداد میں کم اس لیے ہیں کہ ایسی غزلوں کا ایک بڑا حصہ بعد میں انہوں نے خود نکال دیا۔ اور چند غزلیں نسبتِ استادی و شاگردی کی یادگار کے طور پر رہنے دیں۔

(۲) بچوں کی نظمیں ہیں جو اگرچہ معمولی معمولی چیزوں پر لکھی گئی ہیں، مگر بڑی سبق آموز ہیں۔ انگریزی زبان کی یہ خاص خصوصیت ہے کہ اس میں ایسی معمولی چیزوں پر نظمیں لکھی جاتی ہیں اور ان سے بچوں کے کردار بنانے کا کام لیا جاتا ہے۔ اقبال کی ان نظموں کی زبان نہایت صاف سادہ اور رواں ہے۔ اور ان میں محاورہ اور روزمرّہ بول چال کی زبان کی خوبی بھی پائی جاتی ہے

(۳) کچھ نظمیں انگریزی کی نظموں سے ماخوذ ہیں۔ جو ترجمہ ہرگز نہیں معلوم ہوتیں۔ بلکہ اگر ان شعرا کے نام نہ لکھے جاتے جن کی نظموں کے یہ ترجمے ہیں تو یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا کہ یہ اصل خیالات ہیں یا مستعار[2]۔

(۴) صوفیانہ خیالات ہیں اور ان میں وہ خیالات بھی ہیں جن کے بعد میں انہوں نے تردید کی ہے۔ یعنی "وحدۃ الوجود[3]" کا رنگ بھی موجود ہے۔

(۵) اس وقت کی ملکی تحریکات سے متعلق بھی نظمیں ہیں۔ جن میں ہندو مسلم اتحاد پر بڑا زور دیا ہے۔ اور چونکہ یہ ان کے عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا اس لیے طبیعت کا جوش ان نظموں میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے اور کلام سراپا آمد معلوم ہوتا ہے۔ بعد میں اس محدود اتحاد سے انہوں نے برأت[4] کا اظہار کر کے اس کے بجائے ایک عالمگیر اخوت کے پرچار کو اپنے کلام کا موضوع بنا لیا۔

---

[1] نگاہوں میں چکا چوند پیدا کرنے لگے [2] دوسرے سے لیے ہوئے [3] صوفیوں کی اصطلاح ہے
[4] بیزاری۔ علیحدگی۔

دوسرے دور میں۔

(۱) یورپ کے زمانۂ قیام میں، وہاں کی عملی زندگی کے نتائج[1] علامہ اقبال نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اس لیے ان کی حساس[2] طبیعت نے بہت زیادہ اثر قبول کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے شاعری ہی کو ترک کر دینے کا ارادہ کر لیا تاکہ اپنے خیال کے مطابق شاعری میں صرف ہونے والے وقت کو کسی مفید کام میں صرف کر سکیں۔ مگر اُن کا یہ ارادہ سر عبدالقادر کی بر وقت کوشش سے عملی جامہ نہ پہن سکا۔

(۲) زاویۂ[3] نگاہ وہ نہیں رہا۔ یورپ میں رہ کر عینی[4] مشاہدات سے اُن پر اقوام یورپ کی ترقی کا راز کھل گیا کہ یہ سارے کرشمے کوشش پیہم اور جہد مسلسل[5] کے ہیں۔ کوشش کے بغیر فطرت کی مضمر صلاحیتوں کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ نیز اس کے ساتھ ساتھ فلسفہ الہیات ایران پر مضمون لکھنے کی غرض سے جو ادبیات ایران کا مطالعہ کیا تو مشرقی اقوام اور بالخصوص مسلمانوں کی پستی و زبوں[6] حالی کے اسباب بھی ان کو معلوم ہو گئے اور ان اسباب میں ایک بڑا سبب انہوں نے صوفیانہ شاعری کو پایا۔ جس کی وجہ سے بے عملی و فرار کی کیفیت غالب آئی اور ترکِ دنیا و ترکِ عمل کی طرف میلان پیدا ہوا۔ لہٰذا اب انہوں نے غزل کو یا تو سرے سے ترک کر دیا یا غزل کے پیمانوں سے بھی سعی و عمل کی شراب پلانا شروع کر دی۔

(۳) فلسفہ خودی و بے خودی کی جھلکیاں بھی نظر آنے لگیں۔

(۴) ہندو مسلم اتحاد پر کوئی نظم نہیں لکھی اس لیے کہ وطن پرستی اور قومیت کے غیر فطری جذبات نے جو خون آشامیاں[7] یورپ میں کی ہیں اس سے عبرت کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے نہیں چاہا کہ ان کا ملک بھی اسی طرح خاک و خون میں لوٹنے کی سعادت حاصل کرے۔

---

[1] نتیجے [2] احساس رکھنے والی [3] نقطہ نگاہ [4] آنکھوں سے دیکھے ہوئے واقعات۔
[5] لگاتار کوشش [6] خستہ بدحالی۔ [7] خون خرابہ خونریزی۔

(۵) یورپ کی مادہ پرستی کی مذمت کی اور ساتھ ہی تہذیب[1] حجازی کی ستائش[2] بھی کی اور اس کی نجات عالم کا ذریعہ قرار دیا ہے، اور یہی وہ اسباب ہیں جن سے ان کی شاعری نے پیغام کی حیثیت اختیار کر لی ہے

تیسرے دَور میں۔

(۱) علّامہ اس دور میں وطنیت و قومیت کو خیرباد کہہ کر عالمگیر اُخوت کی تعلیم دیتے ہیں۔

(۲) تہذیب جدید کی خرابیوں اور اُن خرابیوں کے اسباب کو بے نقاب کرتے ہیں اور مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ اس سے اجتناب[3] کرنے اور اپنی تہذیب کی طرف لوٹنے کی ہدایت کرتے ہیں۔

(۳) اہلِ مغرب کی سیاسی چالوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرتے ہیں اور ان چالوں کا طلسم توڑ دینے کی تدابیر بھی بتاتے ہیں۔

(۴) عزم و استقلال اور ہمت کا سبق دیتے ہیں اور خودی و بے خودی کے فلسفے کے ذریعے فرد و جماعت کے خصائص[4] اور ان کے ارتقاء و استحکام کے اصول بتلاتے ہیں۔

(۵) فارسی ترکیبیں اور فارسی بندشیں اُن کے کلام میں پہلے کی نسبت بہت زیادہ آگئیں۔ اور فارسی کے مصرعے اور اشعار پہلے سے بھی زیادہ اُردو اشعار کے ساتھ شامل ہونے لگے۔ بلکہ بعض نظموں میں کئی کئی بند فارسی کے نظر آتے ہیں۔

(۶) فارسی شعرا کے کلام پر تضمینیں[5] لکھی ہیں۔

(۷) حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے محبّت بلکہ مدینہ کے

---

[1] اسلامی تہذیب [2] تعریف [3] پرہیز کرنا، الگ رہنا [4] خصوصیتیں [5] دوسرے شاعر کے مصرعے یا مصرع کے ٹکڑے یا شعر پر دوسرے مصرعوں یا اشعار کا اضافہ کرنا۔

لیے بھی تڑپ پیدا ہوجاتی ہے اور عجیب دل کش پیرائے میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔

چوتھے دور میں:-

(۱) طویل نظمیں نہیں ہیں۔ زیادہ تر غزلیں اور چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں۔ اس دور کی شاعری کا مستقل موضوع خودی کا فلسفہ ہے اور اس نشہ میں سرشار ہوکر انہوں نے بڑے بڑے رموز و اسرار معرفتِ خودی کے متعلق بیان کیے ہیں۔ اور اس موضوع کی مختلف جہات پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس کو بڑے موثر انداز میں ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔

(۲) سیاسی موضوع پر بھی بعض اعلیٰ درجے کی نظمیں کہی ہیں جن میں یورپ کی جمہوریت اور روس کی اشتراکیت کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اور ان کے نقائص بھی بتلائے ہیں۔

(۳) اس دور کی سب سے زیادہ پرجوش نظم "ساقی نامہ" ہے جس کو انہوں نے "مثنوی میر حسن" کی بحر میں لکھا ہے اور جیسا کہ مولوی عبدالسلام ندوی کہتے ہیں "اس نظم میں ڈاکٹر صاحب کا جوشِ بیان اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گیا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے جیسے پرجوش الفاظ اور مست خیالات کا ایک سیلاب امنڈا چلا آتا ہے۔

"بانگِ درا" اقبال کی وہ کتاب ہے جس کو ان کی شہرت کا سنگ بنیاد کہنا چاہیے حقیقت یہ ہے کہ عوام میں "بانگِ درا" کی نظموں کی بدولت ہی انہیں شہرت حاصل ہوئی اقبال کی غزلوں اور نظموں کا یہ مجموعہ ۱۹۲۴ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اور ان کے دوست سر عبدالقادر مرحوم نے اس پر ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا جس میں انہوں نے اقبال کی شاعری کے مختلف ادوار کا مختصر مگر جامع ذکر کیا ہے۔

بانگِ درا تین حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّے میں وہ کلام شامل ہے جو انہوں نے ابتدائے شاعری سے ۱۹۰۵ء تک کہا اور دوسرے حصّے میں ۱۹۰۸ء تک کا کلام

شامل ہے (جب کہ وہ یورپ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے)۔ اور تیسرا حصہ ۱۹۰۸ء سے بانگِ درا کی اشاعت تک کے کلام پر مشتمل ہے۔

بانگِ درا میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ ابتدائی غزلوں میں داغ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ مگر جوں جوں اُن کے خیالات میں وسعت اور فکر میں بلندی پیدا ہوتی گئی اُن کے کلام میں غالب کا رنگ پیدا ہونے لگا۔

بانگِ درا کی نظموں کے موضوعات میں بڑی رنگا رنگی ہے۔

(۱) فطری یا نیچرل نظمیں بھی ہیں جن میں اقبال نے مناظرِ قدرت کی تصویر کھینچی ہے۔

(۲) وطنی اور قومی نظمیں بھی ہیں جن میں انہوں نے وطن دوستی کے جذبات کو ابھارا ہے، یا اپنی قوم کو دعوتِ عمل دی ہے۔

(۳) اخلاقی نظمیں بھی ہیں جن میں قوم کو اپنے اندر اخلاقِ حسنہ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے یا کسی واقعے سے کوئی سبق اخذ کیا ہے۔

(۴) تاریخی نظمیں بھی ہیں جن میں تاریخی واقعات نظم کیے ہیں یا بعض مشاہدات کا ذکر کیا ہے

(۵) فلسفیانہ نظمیں بھی ہیں جن میں فلسفہ و حکمت کے نکتے بیان کیے گئے ہیں۔

(۶) دعائیہ نظمیں بھی ہیں جن میں انہوں نے دعائیں مانگیں ہیں۔

(۷) بعض نظموں میں انہوں نے فارسی شعرا کے اشعار پر تضمین کی ہے

(۸) بعض نظموں میں انہوں نے مشہور شعرا کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

(۹) بعض میں ہندوستان کے مشہور مذہبی رہنماؤں کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

(۱۰) کسی قدر اکبر الٰہ آبادی مرحوم کے رنگ کی ظریفانہ نظمیں بھی ہیں۔

خصوصیات بانگِ درا۔

بعض نظموں میں فارسی کی ترکیبیں کثرت سے استعمال کی ہیں حتیٰ کہ بعض شعر ایسے ہیں کہ اگر اردو کے بجائے فارسی کا ایک لفظ رکھ دیا جائے تو پورا شعر فارسی زبان کا ہو جائے۔

ایک خصوصیت یہ ہے کہ اقبال نے اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے بہت سی

جدید ترکیبیں وضع کی ہیں جن کی بدولت اردو زبان میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً
توسنِ ادراکِ انسان، ناقۂ شاہدِ رحمت، قتیلِ ذوقِ استفہام، قربِ فراق آمیز
طوقِ گلوافشار، حسنِ تماشا پسند، شورشِ میخانۂ انسان، دخترِ خوش خرامِ ابر، شانۂ موجِ
صرصر، داغِ مدادِ شب، کلیمِ دردہ سینائے علم، مایۂ دارِ اشکِ عنابی، شکستِ رشتۂ
تسبیحِ شیخ وغیرہ۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ بانگِ درا کے بہت سے اشعار اپنی برجستگی، دل کشی، معنویت اور موزونیت کی وجہ سے زبان زدِ خاص و عام ہو گئے ہیں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اکثر نظموں میں سوز و گداز کی وہ کیفیت پائی جاتی ہے جسے مبصرینِ کلام اقبال نے "کیفِ غم" سے تعبیر کیا ہے۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب کے اکثر اشعار سے محبتِ نوعِ انسانی کا سبق ملتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اگر غور کیا جائے تو کچھ مزید خصوصیات مل جائیں گی۔

بانگِ درا کے بعد ان کے اُردو کلام کا دوسرا مجموعہ "بالِ جبریل" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی اس کے پہلے حصّے میں غزلیں اور کچھ رباعیاں یا قطعات ہیں۔ اور ان میں جوش، بلندی اور رنگینی سب کچھ موجود ہے۔ اس میں وہ نظم بھی ہے جس کو انہوں نے ۱۹۳۳ء میں حکیم سنائی غزنوی کے مزار کی زیارت کے بعد انہی کے ایک مشہور قصیدے کی پیروی میں لکھا ہے۔

دوسرے حصّے میں مختلف موضوعوں پر نظمیں ہیں۔ کچھ نظمیں اندلس کی مشہور عمارات و مقامات پر ہیں اور یہ ان تاثرات کا نتیجہ ہیں جب اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس کی شرکت کے بعد اسپین کی سیر کی اور ان عمارات اور مقامات کا ذاتی طور پر مشاہدہ کیا۔

"ذوق و شوق" کے عنوان سے ایک طویل نظم ہے جس کے اکثر اشعار فلسطین میں لکھے گئے ہیں۔ مختلف عنوانات پر اور بھی چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں۔ لیکن اس حصّے کی سب سے مشہور و مقبول نظم "ساقی نامہ" ہے جو مثنوی سحر البیان کے طرز اور بحر میں لکھی

گئی ہے ۔ اور اس میں جوش، سرمستی اور رنگینی سب کچھ موجود ہے ۔

بال جبریل بانگِ درا کی اشاعت کے عرصۂ دراز کے بعد لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی تو اطمینان ہوا کہ علامہ نے اردو شعر گوئی سے کلیتہً اجتناب نہیں کیا ہے ۔ ورنہ عام طور پہ یہی سمجھا جانے لگا تھا کہ اب انہوں نے اردو کے بجائے فارسی زبان کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنالیا ہے اور یہی نہیں کہ اردو کا اِم کا ایک اور مجموعہ شائقین کے ہاتھوں میں آیا ۔ بلکہ حق یہ ہے کہ ادب اُردو میں اس تصنیف نے اُن جواہر پاروں کا اضافہ کیا ہے جن سے دامنِ اردو اب تک تہی تھا ۔ فکر و تخیل کا شاہکار ہونے کے اعتبار سے اردو کی کوئی تصنیف اس کو نہیں پہنچ سکتی ۔ جن لوگوں کو فارسی سے بہرہ نہیں اور اس سبب سے وہ اقبال کے فارسی کلام ۔ ۔ ۔ ۔ سے استفادہ نہیں کر سکتے ۔ وہ اس کتاب کو پڑھیں ۔ اُن کو اس میں علامہ کے تقریباً وہ تمام افکار مل جائیں گے جو فارسی تصانیف میں کثرت سے پھیلے ہوئے ہیں ۔

تمام کتاب تعلیمات سے بھری ہوئی ہے ۔ راہنماؤں کی کج روی، خلوص و یقین کا فقدان اور طلسمِ مغرب میں گرفتاری پر اقبال نے سخت تنبیہہ کی ہے اور عرفانِ خودی اور مردِ مومن کی خصوصیات اپنے اندر پیدا کرنے کی ترغیب و تحریص نہایت مؤثر پیرائے میں کی ہے ۔ اور امتِ مسلمہ کو پھر ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنی قوتِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کرنے کی طرف متوجہ کیا ہے ۔ اور جمود، اور غلط قسم کے توکل کو چھوڑ کر عزم و ہمت سے کام لے کر اپنی حالت کو درست کرنے اور ترقی و تعالی کی طرف گامزن ہونے کی دعوت دی ہے تاکہ وہ پھر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں ۔

بالِ جبریل کے بعد اُردو کلام کا تیسرا مجموعہ "ضربِ کلیم" کے نام سے پہلی بار جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا ۔ یہ کتاب مختلف عنوانات پر منقسم ہے ۔ ابتدائی حصّے کا کوئی عنوان نہیں ۔ اس میں مختلف چیزوں پر چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں، ان کے علاوہ تعلیم و تربیت، عورت ادبیات، فنونِ لطیفہ، سیاسیاتِ مشرق و مغرب کے عنوانات سے گوناگوں موضوعات

پر اسی قسم کی مختصر نظمیں ہیں، "آخر میں" محراب گل افغان کے افکار" کے نام سے کچھ ایسی نظمیں ہیں۔ جن میں بعض ترانہ یا گیت کی شکل رکھتی ہیں اور دل چسپ ہیں۔ لیکن اس کتاب میں شاعرانہ رنگینی اور دلآویزی کم ہے۔ مگر حقائق و معارف کی جولانیاں بہت زیادہ ہیں۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اور فلسفی اپنے فکر کی بلندیوں پر پہنچ چکا ہے اور اب قلیل الفاظ میں کثیر المعانی حقائق بیان کرنے پر قادر ہے۔

ضربِ کلیم کے حقائق ملّت اسلامیہ ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام اقوام وملل کے لیے شمع ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔ کیونکہ علامہ خود فرما چکے ہیں کہ ضربِ کلیم ایک اعلان جنگ ہے زمانہ حاضر کے نام۔

اردو کلام کا چوتھا اور آخری مجموعہ ہے۔ ارمغانِ حجاز (حصّہ اُردو)۔ ارمغان کی نظموں میں سوز و گداز بھی ہے اور جوشِ بیان بھی۔ کشمیر پر جو نظمیں ہیں۔ اُن میں اہل کشمیر کو ہمت و استقلال کے ساتھ اپنی آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ چند رباعیاں بھی شامل ہیں جو اگرچہ مختلف موضوعات پر ہیں۔ مگر ان سب میں ان کا خاص شاعرانہ انداز موجود ہے۔

.....

انتخابِ نظم

(غزلیات)

(۱)

کبھی اے حقیقتِ منتظر![1] نظر آلباسِ مجاز[2] میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز[3] میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اِسے ترا آئینہ[4] ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ[5] ساز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ[6] بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حُسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز[7] میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

(کلیاتِ اُردو)

---

(۲)

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے
بجلیاں بے تاب ہوں جن کے جلانے کے لیے

---

[1] وہ حقیقت جس کا انتظار کیا جا رہا ہے ذاتِ خداوندی [2] خدا کی ذات کے سوا ہر چیز مجاز ہے
[3] نیازمندی والی پیشانی [4] دل مراد ہے [5] دل [6] درگزر کرنا معاف کرنا [7] سلطان محمود کا غلام ایاز

دل میں کوئی اس طرح کی آرزو پیدا کروں
لوٹ جائے آسماں میرے مٹانے کے لیے
جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو
آہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لیے
اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کے گیت
آہ! یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے
(ایضاً)

(۳)

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں[1] میں
کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں!
کہ لیلےٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل[2] نشینوں میں
مجھے رو کے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں[3] میں
جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس[4] ان کی
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ[5] دل کے سینوں میں؟
کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں[6] میں
محبت کے لیے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

---

[1] رہنے والے [2] اونٹ پر زنانی سواریوں کے بیٹھنے کی جگہ [3] سفینہ، کشتی [4] سانس کی لہر۔
[5] اہلِ دل اللہ والے [6] خرمن سے وہ لوگ جو کھیت کٹنے کے بعد گرے ہوئے خوشے چن لیتے ہیں، فیض حاصل کرنیوالے۔

سراپا حُسن بن جاتا ہے جس کے حُسن کا عاشق
بھلا اے دل! حسین ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں

(ایضاً صہ ۱۰۳)

(۴)

پھڑک اُٹھا کوئی تیری ادائے ماعرفنا[1] پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب نازآفرینوں[2] میں
نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدّت سے چرچے ہیں تیرے، باریک بینوں میں

ایضاً صہ ۱۰۵

---

(۵)

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہو گا
سکوت[3] تھا پردہ دار جس کا، وہ راز اب آشکار ہو گا

گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپکے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ، ہر کوئی بادہ[4] خوار ہو گا

نکل کر صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے ہم نے، وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا[5]

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو۔ وہ اب زرِ کم عیار[6] ہو گا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا

---

[1] نہیں پہچانا ہم نے تجھ کو جیسا تیرے پہچاننے کا حق ہے [2] انبیا مراد ہیں [3] خاموشی [4] شراب پینے والا [5] مسلمان مراد ہے [6] کوٹا

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
میں ظلمتِ[1] شب میں لیکے نکلوں گا اپنے درماندہ[2] کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس میرا شعلہ بار ہوگا

(ایضاً صہ ۱۴۳)

(۶)

یہ سرودِ[3] قمری و بُلبُل فریبِ گوش ہے
باطنِ ہنگامہ آبادِ چمن خاموش ہے
تیرے پیمانوں کا ہے یہ اے مئے مغرب اثر
خندہ زن ساقی ہے، ساری انجمن خاموش ہے
آہ! دنیا دل سمجھتی ہے جسے، وہ دل نہیں
پہلوئے انساں میں اک ہنگامۂ خاموش ہے
زندگی کی رہ میں چل، لیکن ذرا بچ بچ کے چل
یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بار دوش ہے
جس[4] کے دم سے دلّی و لاہور ہم پہلو ہوئے
آہ! اے اقبالؔ! وہ بُلبُل بھی اب خاموش ہے

(ایضاً صہ ۲۷۸)

(۷)

کیا عشق ایک زندگیٔ مستعار کا!
کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا!
وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش[5] و انتظار کا!
میری بساط[6] کیا ہے؟ تب و تابِ یک نفس!
شعلہ سے بے محل[7] ہے اُلجھنا شرار کا!

---

[1] اندھیرا [2] عاجز، تھکا ہوا [3] گانا [4] مرزا داغ دہلوی مُراد ہیں [5] تڑپنا، تڑپ [6] حیثیت [7] بے جا، نامناسب۔

کر پہلے مجھ کو زندگی جاوداں عطا پھر ذوق و شوق دیکھ دل بیقرار کا!
کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

(ایضاً صہ ۳۰۱)

---

(۸)

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی! ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی!
تین سو[1] سال سے ہیں ہند کے میخانے بند اب مناسب ہے، ترا فیض ہو عام اے ساقی!
میری مینا[2] ئے غزل میں تھی ذرا سی باقی شیخ کہتا ہے کہ یہ بھی حرام اے ساقی!
شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق[3] تہی رہ گئے صوفی و ملّا کے غلام اے ساقی!
عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کی ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

(ایضاً صہ ۳۰۴)

---

(۹)

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی! میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی[4]
اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی[5]
وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو[6] کرگسوں میں اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی
نہ زباں کوئی غزل کی، نہ زباں سے باخبر میں کوئی دلکشا صدا ہو، عجمی ہو یا کہ تازی!
کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!

(ایضاً صہ ۳۰۹)

---

[1] حضرت مجدّد الف ثانی کی طرف اشارہ ہے [2] بوتل [3] جنگل [4] غزل گوئی۔
[5] امام فخر الدین رازی [6] کرگس۔ گدھ۔

(١٠) پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن[1]
مجھ کو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مُرغِ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اُودے اُودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حسنِ[2] بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟
(ایضاً ص ۳۲۲)

(١١)

دل بیدار فاروقی، دل بیدار کراری!
مسِ[3] آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری!
مشامِ[4] تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
ظن و تخمین[5] سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری[6]

خداوند! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں!
کہ درویشی بھی عیّاری ہے سلطانی بھی عیّاری!
(ایضاً ص ۳۲۹)

(١٢) زمستانی[7] ہوائیں، گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحرخیزی

---

[1] جنگل [2] خدا [3] کانسی [4] دماغ [5] شک و شبہ [6] خدا مراد ہے۔
[7] جاڑوں کی۔

کہیں سرمایۂ محفل تھی میری گرم گفتاری
کہیں سب کو پریشاں کر گئی میری کم آمیزی[1]
زمامِ[2] کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو، پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
جلالِ[3] بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
سوادِ[4] رومۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے
وہی عبرت، وہی عظمت وہی شانِ دلآویزی

(ایضاً صد ۳۳۲)

---

(۱۳)

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی[5] — کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو — کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!
نومید نہ ہو ان سے، اے رہبرِ فرزانہ! — کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی
اے طائرِ[6] لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی[7]

(ایضاً صد ۳۴۸)

مناروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و[8] بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

---

[1] کم ملنا۔ [2] باگ دوڑ [3] شان و شکوہ [4] میدان [5] اپنے آپ کو پہچاننا۔
[6] انسان مراد ہے [7] مکاری۔ [8] یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں۔

تو شاہین ہے، پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

(ایضاً صہ ۳۵۳)

پہلی ۶ غزلیں بانگِ درا سے لی گئی ہیں اور باقی بالِ جبریل سے

قطعات و رباعیات

(۱)

جوانوں کو مری آہِ سحر دے　　پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے　　مرا نورِ بصیرت عام کر دے

---

(۲)

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں　　غلامِ طغرل[1] و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن　　کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

(کلیاتِ اردو صہ ۳۷۸)

---

(۳)

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے　　مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے[2]
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق　　کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

(ایضاً صہ ۳۷۷)

---

(۴)

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے!　　وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے!
نماز و روزہ و قربانی و حج　　یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے!

(ایضاً صہ ۳۸۱)

---

[1] سلجوقی خاندان کے شان و شوکت والے بادشاہ　[2] خون سفید ہو گئے ہیں۔

(۵)

کہا اقبال نے شیخ حرم سے — تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون؛
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی — فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؛

ایضاً ص ۶۷۳

(۶)

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر — حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں[۱] بخشی ہے تو نے — اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

(۷)

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر — شریکِ زمرۂ لا یحزنون[۲]، کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں — مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر!

(ایضاً ص ۳۷۹)

(۸)

ترا جوہر ہے نوری، پاک ہے تو — فروغِ[۳] دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں[۴] افرشتہ و حور — کہ شاہینِ شہِ لولاک[۵] ہے تو

(ایضاً ص ۳۷۶)

(۹)

کل اپنے مریدوں سے کہا پیرِ مغاں نے — قیمت میں یہ معنی ہے دُرِ ناب سے دہ چند
زہراب ہے، اس قوم کے حق میں مئے افرنگ — جس قوم کے بچے نہیں خوددار و ہنرمند

(ایضاً ص ۳۶۲)

---

[۱] جو کی روٹی۔ [۲] وہ لوگ جن کی شان میں لاخوفٌ علیہم ولا ھم یحزنون آیا ہے اولیاء اللہ جن کو خوف ہوتا ہے نہ رنج [۳]۔ فروغ روشنی [۴]۔ کمزور شکار [۵] حضور سرور کائنات۔

(۱۰)

غریبی میں ہوں محسودِ امیری
کہ غیرت مند ہے میری فقیری

حذر اس فقر و درویشی سے جس نے
مسلماں کو سکھا دی سربزیری[1]

(ایضاً صہ ۶۷۲)

(۱۱)

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

(ایضاً صہ ۶۷۴)

رباعیات نمبر ۵ ، ۱۰ ، ۱۱ ارمغانِ حجاز سے لی ہیں باقی بالِ جبریل سے۔

---

[1] سر جھکائے ہوئے رہنا۔

منظومات

(۱)

ابرِ کُہسار

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن[1] میرا   ابرِ کہسار ہوں، گُل پاش[2] ہے دامن میرا
کبھی صحرا، کبھی گلزار ہے، مسکن[3] میرا   شہر و ویرانہ مرا، بحر مرا، بن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُرافشاں ہونا   ناقۂ[4] شاہدِ رحمت[5] کا حُدی[6] خواں ہونا
غم زدائے[7] دلِ افسردۂ دہقاں ہونا   رونقِ بزمِ جوانانِ گلستاں ہونا
بن کے گیسو رُخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ[8] موجۂ صرصر[9] سے سنور جاتا ہوں

دور سے دیدۂ امید کو ترساتا ہوں   کسی بستی سے جو خاموش گزر جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لبِ جُو[10] آتا ہوں   بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں
سبزۂ مزرعِ نوخیز[11] کی امید ہوں میں
زادۂ بحر[12] ہوں پروردۂ خورشید ہوں میں

۱۔ گھر۔ ۲۔ پھول برسانے والا ۳۔ رہنے کی جگہ ۴۔ اونٹنی ۵۔ باران رحمت کو شاہد کہا ہے
۶۔ اونٹ کے لیے گانے بجانے والا ۷۔ غم والا ۸۔ کنگھا ۹۔ ہوا کی لہر ۱۰۔ نہر کا کنارا
۱۱۔ ابھی ابھی اگی ہوئی کھیتی۔ ۱۲۔ سمندر کا بچہ

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم[۱۳] میں نے
اور پرندوں کو کیا محوِ[۱۴] ترنم میں نے

سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قم[۱۵] میں نے
غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے

فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

(کلیاتِ اقبال صہ ۲۸، ۲۷)

---

[۱۳] سمندر [۱۴] گانا [۱۵] کھڑا ہو جا۔

(۲) موجِ دریا

مضطرب[1] رکھتا ہے میرا دلِ بیتاب مجھے　　عینِ ہستی[2] ہے تڑپ صورتِ سیماب[3] مجھے
موج ہے نام مرا، بحر ہے پایاب[4] مجھے　　ہو نہ زنجیر کبھی حلقۂ گرداب[5] مجھے
آب میں مثل ہوا جاتا ہے توسن[6] میرا
خارِ ماہی[7] سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا

میں اچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہ کامل سے　　جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے
ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے　　کیوں تڑپتی ہوں، یہ پوچھے کوئی میرے دل سے
زحمتِ تنگیٔ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

(ایضاً صہ ۶۲)

ابرِ کہسار
شرح و وضاحت

گُل پاش ہے دامن میرا۔ میں ہی پھولوں کے اُگنے کا باعث ہوں۔
دُر افشاں؛ موتی بکھیرنے والا۔ یہاں استعارے کے طور پر بارش کی بوندیں مراد ہیں۔ ظاہر ہے ان بوندوں سے ہی کھیتاں سرسبز ہوتی ہیں۔ تو یہ بوندیں کسان کی نظر میں موتی سے کیا کم ہیں۔
ناقۂ شاہدِ رحمت کا حدی خواں ہونا۔ بادل خدا کی رحمت کا نشان ہے اس لیے اسے

---

[1] بیقرار [2] زندگی۔ [3] پارہ۔ [4] تھنے تھنے پانی [5] بھنور کا چکر [6] گھوڑا [7] مچھلی کے کانٹے

شاہدِ رحمت کے ناقہ کا حُدی خواں ہونے والا قرار دیا ہے۔ کیونکہ حُدی خواں ناقہ (اونٹنی) کو حدی (سرود) سناتا ہے تو وہ تیز چلتی ہے۔

حُدی: وہ نغمہ یا سرود جو شتربان اونٹوں کو تیز چلانے کے لیے گاتے ہیں۔

بن کے گیسو رُخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں: جس طرح گیسو کسی حسین کے رُخساروں پر بکھر جاتے ہیں تو اُس کے حُسن کو چار چاند لگا دیتے ہیں، اسی طرح جب بادل برستا ہے تو سبزہ لہلہانے لگتا ہے اور زمین خوبصورت معلوم ہونے لگتی ہے۔

شانۂ موجۂ صرصر بھی استعارہ ہے۔ تیز ہوائیں مجھے بکھیر کر خوشنما بنا دیتی ہیں۔

گرداب کی بالیاں پہناتا ہوں: جب پانی میں بوندیں پڑتی ہیں تو قدرتی طور پر حلقے بن جاتے ہیں۔ ان حلقوں کو شاعر نے گرداب کی بالیاں قرار دیا ہے۔

زادۂ بحر: سمندر کا بیٹا جب آفتاب سمندر پر چمکتا ہے۔ تو اس کی حرارت سے پانی بھاپ بن کر اُڑتا ہے اور وہ بھاپ اوپر جاکر بادل کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے شاعر نے بادل کو سمندر کا بیٹا کہا ہے۔

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے: جب پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے تو پہاڑی ندیوں میں غیر معمولی جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ بڑے زور شور سے بہنے لگتے ہیں۔

ذوقِ تبسم دیا کھلا کر پھول بنا دیا۔

موجِ دریا

جذبِ مہِ کامل: جب چودہویں رات کا چاند سمندر پر چمکتا ہے تو قانونِ قدرت کے مطابق پانی میں تلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔ اور موجیں اونچی ہونے لگتی ہیں۔

اس نظم میں اقبال نے موج کی کیفیت بیان کی ہے کہ حرکت، اضطراب اور روانی اس کی ذات کا خاصہ ہے۔ جس طرح سیماب کو ایک لمحہ کے لیے قرار نصیب نہیں ہوتا اسی طرح موج بھی ہر وقت رواں دواں اور بیقرار رہتی ہے۔ اس کی اس روانی اور حرکت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ دریا میں کوئی چیز گرداب ہو یا خارِ ماہی، موج کی روانی کو نہیں روک سکتی۔

۳

جگنو

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں؟

آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں؟

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت[1] میں آکے چمکا، گمنام تھا وطن میں

تکمہ[2] کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا؟
ذرّہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں؟

چھوٹے سے چاند میں ہے، ظلمت بھی، روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے، آیا کبھی گگن میں

پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب[3]، یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری[4] دی
پروانہ کو تپش دی[5]، جگنو کو روشنی دی

رنگین[6] نوا بنایا مرغانِ بے زباں کو
گل کو زبان دے کر تعلیمِ خامشی دی

نظارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی
چمکا کے اس پری[7] کو تھوڑی سی زندگی دی

رنگیں کیا سحر کو، بانکی دُلہن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی

سایہ دیا شجر کو، پرواز دی ہوا کو
پانی کو دی روانی، موجوں کو بیکلی دی

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

(ایضاً ص ۸۴)

---

[1] پردیس۔ [2] گھنڈی بٹن [3] چاہنے والا [4] دلکشی [5] تڑپ [6] خوش آواز
[7] مراد شفق [8] چاند تارے وغیرہ۔

جگنو :-

گل کو زباں دے کر تعلیمِ خاموشی دی ۔ شعرا گلاب کی پنکھڑی کو زبان سے تشبیہہ دیتے ہیں ۔ گل کو زبان دے کر قدرت نے اس کو خاموش رہنے کی تعلیم دی ہے کہ وہ باوجود زبان رکھنے کے خاموش رہے ۔

---

(۴) بزمِ انجم

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو
طشتِ افق سے لیکر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے
وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے
کہتا ہے جن کو انسان اپنی زباں میں تارے
محوِ فلک فروزی[1] تھی انجمن فلک کی
عرشِ بریں سے آئی آواز اک ملک کی
اے شب کے پاسبانو! اے آسماں کے تارو!
تابندہ[2] قوم ساری گردوں نشیں تمہاری
چھیڑو سرود[3] ایسا جاگ اٹھیں سونے والے
رہبر ہے قافلوں کی تابِ[4] جبیں تمہاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں
شاید سنیں صدائیں اہلِ زمیں تمہاری
رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے
وسعت تھی آسماں کی معمور[5] اس نوا سے
حسنِ ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں
جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں
آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے
جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

---

[1] آسمان کو روشن کرنا [2] چمکنے والی [3] گانا [4] پیشانی کی چمک [5] آباد

ہیں جذب[1] باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں۔

(ایضاً ص ۱۷۳۔)

شرح و وضاحت:۔

بزمِ انجم:۔

شامِ سیہ قبا:۔ چونکہ شام کے وقت ہر طرف سیاہی چھا جاتی ہے اس لیے شاعر نے شام کو سیاہ قبا والی کہا ہے۔

لالے کے پھول مارے:۔ سورج نے افق کو سرخ کر دیا۔ وہ شفق مُراد ہے جو غروبِ آفتاب کے وقت نظر آتی ہے۔

محمل میں خامشی کے:۔ رات کی لیلےٰ خاموشی کے محمل میں بیٹھ کر آئی یعنی رات ہو گئی اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

چمکے عروسِ شب کے الخ:۔ تارے چمکنے لگے۔

محوِ فلک فروزی الخ:۔ تارے آسمان کو روشن کرنے میں مصروف تھے۔

آئینے قسمتوں کے الخ:۔ دنیا والے چونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی قسمت ستاروں سے وابستہ ہے یا ستارے ان کی قسمت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ وہ تمہارے پیغام کو غور سے سنیں گے۔

شبنم کی آرسی:۔ چونکہ شبنم کے قطرے میں گلاب کا عکس نظر آتا ہے اس لیے شاعر نے قطرۂ شبنم کو آرسی کہا ہے۔

آئینِ نو سے ڈرنا:۔ اپنی قومی زندگی میں تبدیلی سے ڈرنا۔

رواروی:۔ ہنگامہ چل چلاؤ۔ بھاگ دوڑ۔

---

[1] کشش

جذبِ باہمی سے کشش کا قدرتی قانون مراد ہے۔ مگر حسنِ تعلیل کے طور پر اس سے باہمی الفت مُراد لی ہے۔

اس نظم کے ذریعے اقبال نے قومی زندگی کا راز بتلایا ہے کہ مسلمان اگر بہ حیثیت قوم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو وہ تاروں کے نظام سے سبق حاصل کریں۔ تاروں کا نظام جذبِ باہمی سے قائم ہے اسی طرح مسلمان بھی باہمی محبت کی بدولت زندہ بھی رہ سکتے ہیں اور ترقی بھی کر سکتے ہیں۔

(۵) بلالؓ

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا — حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی — تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایکدم کے لیے — کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے

جفا جو عشق میں ہوتی ہے، وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

نظر تھی صورتِ[1] سلمانؓ ادا شناس تری — شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثلِ کلیم سودا تھا — اویسؓ[2] طاقتِ دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا — ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا
تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید — خنک[3] دلے کہ تپید و دمے نیا سائید
گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا[4] پر — کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰؑ پر

تپش ز شعلہ گرفتند و بر دلِ زدند
چہ برقِ جلوہ بخاشکِ حاصلِ تو زدند!

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری — کسیؐ کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی — نماز اس کے نظارے کا ایک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب[5] مقام تھا اُسؐ کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اُس کا

---

۱ سلمان کی طرح ۲ ایک بزرگ جو حضورؐ کو نہ دیکھ سکے ۳ مبارک ہے وہ دل کہ تڑپتا ہی رہا اور ایک دم بھی جس نے آرام نہ لیا ۴ بیقرار ۵ مدینہ۔

شرح و وضاحت

بلال رضؓ

جبش سے حجاز لے آئی :۔ حجاز میں آکر تجھے دولتِ اسلام نصیب ہوئی

وہ آستاں : سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا آستاں ۔

کسی کے ۔ آنحضرتؐ کے ۔

مزے ستم کے لیے ۔ اپنے کافر آقا کے ظلم و ستم برداشت کیے ۔

اُویس طاقتِ دیدار کو ترستا تھا ۔ حضرت اُویس قرنی حضورؐ کے سچے عاشقوں میں بہت ممتاز حیثیت رکھتے تھے ۔ چونکہ ان کی والدہ بہت ضعیف تھیں اس لیے حضورؐ نے اُن کو حکم دیا کہ تم میری ملاقات کے لیے مت آؤ بلکہ اپنی ماں کی خدمت کرو ۔ اس میں میری خوشنودی مضمر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو حضورؐ کے دیدار کی مسرت نہ حاصل ہو سکی ۔

تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرت دید :۔ حضرتِ بلالؓ حضورؐ کے سچے عاشقوں میں سے تھے اور ان کو حضورؐ سے اس قدر محبت تھی کہ حضورؐ کو مسلسل دیکھتے رہنے کے باوجود ان کے دل کو سیری نہیں ہوتی تھی ۔

کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دست موسیٰؑ پر :۔ جب حضرت موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ (اپنی بغل سے) نکالا تو وہ دیکھنے والوں کو بالکل سفید نظر آیا ۔ یہاں دست موسیٰؑ سے سفیدی مُراد ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اے بلال ! حضورؐ کے عشق کی بدولت آپ کی سیاہ رنگت موسیٰؑ کے ہاتھ کی سفیدی سے بھی زیادہ بخت والی تھی ۔

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری :۔ آپ کے دیکھنے میں نیاز کا رنگ جھلکتا تھا ۔

اذاں اذل سے ترے عشق کا ترانہ بنی :۔ عشق نبیؐ کی بدولت تیری ہی آوازِ اذاں میں عجیب سوز و گداز کا رنگ پیدا ہو گیا تھا ۔

. . . . .

سلمانِ فارسیؓ

آپ پہلے مجوسی تھے اور "ماہ بہ" یا "روزبہ" نام تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں اصفہان (ایران) سے حاضر ہو کر مسلمان ہوئے اور ابوعبداللہ سلمان فارسی کہلائے گئے۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا ہے۔ سلمانؓ منّا اہل البیت "سلمان میرے اہل بیت میں ہے۔ صدق، توکل اور قناعت کے لیے مشہور ہیں۔ آپ سے کسی نے پوچھا سلمان! آپ کا شجرۂ نسب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا سلمان ابن اسلام یعنی اب فلاں ابن فلاں پر فخر نہیں، فرزندِ اسلام ہونے پر فخر ہے۔

اُویسِ قرنی

قرن، یمن کے ایک قبیلے کا نام ہے حضرت اویسؓ اس قبیلے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قرنی کہلاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشقوں میں بہت ممتاز سر تبر رکھتے ہیں۔ چونکہ حضرت اویس کی والدہ بہت ضعیف تھیں اس لیے حضورؐ نے ان کو یہ حکم دیا کہ تم میری ملاقات کے لیے نہ آؤ بلکہ اپنی ماں کی خدمت کرو اسی میں میری خوشنودی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو حضورؐ کے دیدار کی مسرت حاصل نہ ہو سکی۔

---

(۶) حضورِ رسالت مآبؐ میں

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا — جہاں سے باندھ کے رختِ[1] سفر روانہ ہوا
قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی لیکن — نظامِ کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا
فرشتے بزمِ رسالتؐ میں لے گئے مجھ کو
حضورؐ آیۂ رحمت[2] میں لے گئے مجھ کو

کہا حضورؐ نے اے عندلیبِ[3] باغِ حجاز! — کلی کلی ہے تری گریۂ نوا سے گداز
ہمیشہ سرخوشِ جامِ ولا ہے دل تیرا — فتادگی ہے تری غیرتِ سجودِ نیاز
اڑا جو پستیِ دنیا سے تو سوئے گردوں — سکھائی تجھ کو مالک[4] نے رفعتِ[5] پرواز
نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ[6] ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی
چھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

(ایضاً صہ ۱۹۷)

---

[1] سامانِ سفر [2] آنحضرتؐ [3] بلبل [4] فرشتے [5] پرواز کی بلندی [6] باغ

شرح و وضاحت
حضور رسالت مآبؐ میں

ہنگامہ زمانہ : وہ مصائب مراد ہیں جو اس بیسویں صدی کے آغاز سے مسلمانوں پر نازل ہونے شروع ہوئے ۔

عندلیب باغِ حجاز :۔ سرزمین حجاز کا بلبل ، عاشق رسولؐ ۔

کلی کلی ہے تری امنح :۔ اسلام کی محبت تیری رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے ۔

سر خوشِ جامِ ولا :۔ محبت کی شراب میں مست رہنے والا ۔

غیرتِ سجود نیاز : عاشق کے سجدے سے بڑھ کر ۔

آبگینہ : جامِ بلورین : اعلیٰ قسم کے بلور کا پیالہ ۔

یہ نظم اقبال نے اُس جلسے میں سنائی تھی جو ۱۹۱۲ء میں شاہی مسجد لاہور میں، حضرت مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی کوشش سے منعقد ہوا تھا ۔ جلسہ کی غرض یہ تھی کہ جنگ بلقان کے سلسلے میں ترکوں کی مالی امداد کے لیے چندہ جمع کیا جائے ۔ مولانا مرحوم نے ۱۹۱۱ء میں سب سے پہلے ترکوں کے لیے چندہ جمع کیا ۔ اس طبّی وفد کی وساطت سے ترکوں کو بھجوایا جو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں قسطنطنیہ گیا تھا تاکہ مجروحین کی تیمارداری کر سکے ۔

---

(٧) جنگ یرموک کا ایک واقعہ

صف بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ بند
تھی منتظر حنا کی عروسِ زمینِ شام
اک نوجوان صورتِ سیماب مضطرب
آکر ہوا امیرِ عساکر سے ہم کلام
اے ابوعبیدہ رخصتِ پیکار دے مجھے
لبریز ہوگیا مِرے صبر و سکوں کا جام
بیتاب ہو رہا ہوں فراقِ رسولؐ میں
اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام
جاتا ہوں میں حضورِ رسالت پناہ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام
یہ ذوق و شوق دیکھ کے پُرنم ہوئی وہ آنکھ
جس کی نگاہ تھی صفتِ تیغِ بے نیام
بولا امیرِ فوج کہ "وہ نوجواں ہے تو
پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام
پوری کرے خدائے محمدؐ تری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہِ رسولِ امیںؐ میں تو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پہ کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضورؐ نے

(ایضاً ص ۲۴۷)

شرح و تشریح

جنگِ یرموک کا ایک واقعہ

حنا سے خون مراد ہے۔

امیرِ عساکر: سپہ سالارِ فوج۔ صورتِ سیماب، مضطرب: شوقِ شہادت پر بے تاب۔

صبر کا جام لبریز ہوگا ۔ اب میں بالکل صبر نہیں کرسکتا۔

جنگِ یرموک :۔ عہد فاروقی رضؓ کی فیصلہ کن جنگوں میں سے ہے ۔ یہ جنگ ۱۵ھ میں ہوئی تھی ۔ جس میں بیس ہزار مسلمانوں نے دو لاکھ رومیوں کو شکستِ فاش دی تھی اس جنگ کے بعد رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصے میں سارا ملکِ شام مسلمانوں کے قبضے میں آگیا یرموک کا میدان اردن کے علاقے میں دمشق کے کچھ فاصلے پر ہے ۔

حضرت ابوعبیدہؓ ابن جرّاح کی جلالتِ شان کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ وہ "عشرہ مبشرہ" میں سے ہیں ۔ان دس اصحابِ رسولؐ میں سے، جن کے جنتی ہونے کی بشارت ان کی زندگی ہی میں حضورؐ اکرم نے دی تھی ۔

حضرت ابوعبیدہؓ کا شمار شجاعانِ عرب میں ہے ۔ ہر معرکہ میں حضورؐ کے ساتھ رہے لیکن جنگِ اُحد میں انہوں نے اپنی شجاعت کے جوہر پورے کمال کے ساتھ دکھائے اور حضورؐ کی خوشنودی حاصل کی ۔حضرت عمر رضؓ نے انہیں سپہ سالار بنا کر شام بھیجا ۔چنانچہ تاریخ میں ان کا نام فاتحِ شام کے لقب سے مشہور ہے ۔

اس پرجوش نظم میں اقبال نے ایک مومن کے شوقِ شہادت کا تذکرہ تحریر کیا ہے جس سے ان کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اُس دور کے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ پر کس قدر پختہ یقین تھا ۔

---

(۸) بلادِ[1] اسلامیہ

سرزمینِ دلی کی مسجودِ[2] دلِ غم دیدہ[3] ہے
ذرّے ذرّے میں لہو اسلاف[4] کا خوابیدہ ہے
پاک اس اُجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں ؟
خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں
سوتے ہیں اس خاک میں خیر الامم[5] کے تاجدار
نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار
دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیِ محفل کی یاد
جل چکا حاصل[6] مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

ہے زیارت گاہِ مُسلم گو جہاں آباد[7] بھی
اس کرامت[8] کا مگر حقدار ہے بغداد بھی
یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لیے سامانِ ناز
لالۂ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیبِ حجاز
خاک اس بستی کی ہو کیونکر نہ ہمدوشِ[9] ارم
جس نے دیکھے جانشینانِ پیمبرؐ کے قدم
جس کے غنچے تھے چمن ساماں، وہ گلشن ہے یہی!
کانپتا تھا جن سے روما، ان کا مدفن ہے یہی!

---

[1] اسلامی شہر [2] جس کو سجدہ کیا جائے [3] غم زدہ [4] باپ دادا [5] مسلمان قوم کا لقب۔
[6] خرمن [7] دلی [8] بزرگی [9] برابر۔

ہے زمینِ قرطبہ[1] بھی دیدۂ مسلم کا نُور
ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طُور
بجھ کے بزمِ ملّتِ بیضا پریشاں کر گئی
اور دِیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں[2] کر گئی

قبر اس تہذیب کی یہ سرزمینِ پاک ہے
جس سے[3] تاکِ گلشنِ یورپ کی رگ نمناک ہے

خطۂ قسطنطنیہ، یعنی قیصر کا دیار
مہدیِ امت کی سطوت کا نشانِ پائدار
صورتِ خاکِ حرم[4] یہ سرزمیں بھی پاک ہے
آستانِ مسندآرائے شہِ لولاک[5] ہے
نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تربتِ ایوب[6] انصاری سے آتی ہے صدا

اے مسلماں ملّتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کے کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

وہ زمیں ہے تو، مگر اے خوابگاہِ[7] مصطفےٰ!
دید ہے کعبے کو تیری حج اکبر سے سوا
خاتم[8] ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
نام لیوا جس کے شاہنشاہِ عالم کے ہوئے

ہسپانیہ [2] روشن [3] انگور کی بیل [4] کعبہ [5] صحابی حضورؐ [6] مدینہ [7] انگوٹھی

جانشیں قیصر کے، وارث مسندِ جم کے ہوئے
ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی، نہ فارس ہے، نہ شام
آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو، ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
جب تلک باقی ہے تو، دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں
(کلیاتِ اردو صہ ۱۴۷)

بلادِ اسلامیہ :-

بلاد : جمع ہے بلد کی۔ بلد بمعنی شہر

مسجودِ دلِ غم دیدہ :- یعنی مسلمانوں کے غمگین دلوں کو بہت محبوب ہے۔

اسلاف کا لہو خوابیدہ ہے : ہمارے آبا واجداد کا خون اس کے ذرّے ذرّے میں ملا ہوا ہے۔

خیر الامم : اُمم جمع ہے اُمّت کی بمعنی قوم یا جماعت، خیر بمعنی بہترین بہترین قوم سے مراد مسلمان قوم ہے۔

جہان آباد : دلی :-

ہمدوشِ ارم : ارم وہ حسین شہر ہے جسے شداد نے بسایا تھا اور جس میں اس نے جنتِ ارضی بنائی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ بغداد بھی ارم کی طرح حسین شہر تھا۔

جانشینانِ پیمبرؐ : سلاطینِ عباسیہ مراد ہیں۔

چمن سامان سے مراد یہ ہے کہ ہر غنچہ اپنی جگہ ایک چمن تھا۔

کانپتا تھا جس سے روما : اشارہ ہے مشرقی سلطنتِ روم (قسطنطنیہ) کے

عیسائی فرمانرواؤں کی طرف جو سلاطین عباسیہ بالخصوص ہارون، مامون، متوکل کی سطوت سے کانپتے تھے۔

بزمِ ملّت بیضا : مسلمان قوم

مہدیِ اُمّت : ایک ضعیف حدیث میں سلطان محمّد الملقب بہ فاتح کو جس نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا تھا، اس امّت کا مہدی قرار دیا گیا ہے۔

شہِ لولاک : لقب ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا۔

آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے : قسطنطنیہ، حضور اکرمؐ کے جانشینوں یا خلفاء (عثمانی) کا آستانہ، دارالخلافہ ہے۔

حضرت ایوب انصاریؓ : سرکار دو عالمؐ کے مشہور صحابہ میں سے ہیں ان کو حضورؐ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ اور ۴۹ھ میں جب امیر معاویہ نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے لیے دوسرا لشکر بھیجا تو اس میں حضرت ایوب انصاریؓ بھی شریک ہوئے اور داد شجاعت دی۔ لیکن دوران محاصرہ میں وفات پائی۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کو قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے دفن کیا گیا۔

کشت و خون کا حاصل : جنگ و جدل کا نتیجہ۔

خوابگاہِ مصطفےٰ : مدینہ طیبّہ کی سرزمین۔

خاتمِ ہستی : کائنات۔

نقطۂ جاذب الخ۔ تجھ سے محبت شعاعیں پھوٹ کر نکلتی ہیں۔ یا تو دنیا بھر کے مسلمانوں کی محبت کا مرکز ہے۔ یا تیری طرف مسلمانوں کے دل کھنچے چلے جاتے ہیں۔

---

(۹) ہسپانیہ

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرمِ پاک ہے تو میری نظر میں

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

روشن تھیں ستاروں کی طرح انکی سنانیں[1]
خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی
باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں
مانا وہ تب و تاب نہیں اس کے شرر میں

غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن
تسکین مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں!

(کلیاتِ اردو صہ ۹۵)

ہسپانیہ :-

یہ نظم ان جذبات کی آئینہ دار ہے جو سیاحت ہسپانیہ کے بعد اقبال کے سینہ میں موجزن ہوئے اقبال نے اپنی تصانیف میں جابجا زوالِ قرطبہ اور غرناطہ پر آنسو بہائے ہیں۔

---

[1] برچھیاں [2] کوڑا کرکٹ ، مراد کافر۔

طارق کی دُعا

(۱۰) (اُندلس کے میدانِ جنگ میں)

یہ غازی، یہ تیرے پُراسرار[1] بندے — جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی[2]
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ اُن کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو — عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن — نا مالِ غنیمت نہ، کشور کشائی

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا — خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں!
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو — وہ سوز اس نے پایا انہیں کے جگر میں!
کشادِ در دل سمجھتے ہیں اس کو — ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں!
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے — وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں!

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

(ایضاً صـ ۳۹۷)

طارق کی دُعا:

اقبال نے اس دلکش اور نہایت موثر نظم میں بطلِ اسلام طارق ابن زیاد فاتح اندلس

---

[1] جس کی حقیقت سمجھ میں نہ آئے مراد مسلمان [2] حکمرانی کا ذوق۔

کے ان جذبات کی عکاسی اپنے الفاظ میں کی ہے جو آغاز جنگ سے پہلے، اس مردِ مومن کے دل میں موجزن ہوتے ہوں گے۔ اور پھر دُعا کی صورت میں اس کی زبان پر آئے ہوں گے۔

اگرچہ دُعا کے الفاظ بعینہٖ اقبال تک نہیں پہنچے لیکن جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کو پڑھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالباً طارق نے اللہ سے اسی طرح کی دعا مانگی ہوگی

---

(۱۱) گدائی

میکدے میں ایک دن اک رندِ زیرک[1] نے کہا
ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا!
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے؟
کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا؟
اس کے آبِ[2] لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا!
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے؟ مردِ غریب و بے نوا
مانگنے والا گدا ہے! صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

(کلیات اُردو ص ۱۱۶)

---

[1] ہوشیار [2] شراب۔

(۱۲) ایک نوجوان کے نام

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالین ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری رضؓ تجھ میں، نہ استغنائے سلمانی رضؓ
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلّی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی!
عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے! بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

(کلیاتِ اُردو صر ۴۱۱)

(۱۳) نصیحت

بچۂ شاہین سے کہتا تھا عقاب سالخوردہ
اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں!
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں!
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر!
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں!

(کلیاتِ اُردو صہ ۳۱۲)

(۱۴) نپولین کے مزار پر

رازہے ، رازہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کُھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع !
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز!
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب و فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز!
ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس
عوضِ یک دو نفس قبر کی شبہائے دراز!

(کلیاتِ اُردو ص۱۴۴۰)

نپولین کے مزار پر:-

چونکہ نپولین کی زندگی عمل اور جدوجہد کا ایک نمونہ تھی اس لیے اقبال نے اس نظم کے ذریعے اس کی شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

اقبال نے اس نظم کا جو عنوان قائم کیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتبہ اس کے لوحِ مزار پر کندہ ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کا مزار زبانِ حال سے دنیا کو یہ درس دے رہا ہے کہ انسان کی زندگی جدوجہد ہی کا دوسرا نام ہے۔

لہ۔ جوشِ عمل۔

(۱۵) خوشحال خاں کی وصیّت

قبائل ہوں ملّت کی وحدت میں گم — کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے — ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!
مغل سے کسی طرح کمتر نہیں — قہستاں کا یہ بچۂ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات — وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند

اڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ
مغل شہسواروں کی گرد سمند!

خوشحال خاں :-

اس نظم میں اقبال نے سرحد کے مشہور ملّی دوست شاعر خوشحال خاں کے جذبات کو اپنے انداز میں نظم کیا ہے۔ خوشحال خاں نے افغانستان کی آزادی کے لیے سرحد کے قبائل کی ایک جمعیت تیار کی۔

اُس کی تقریباً سو نظموں کا انگریزی میں ترجمہ ہوا۔

---

(۱۶) مردِ مسلمان

ہر لحظہ[۱] ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں، کردار میں اللہ کی بُرہان[۲]

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!

ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن، نہ بخارا نہ بدخشاں!

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

(کلیات اردو ۵۴۲)

۱۔ ہر آن ۲۔ دلیل۔

(۱۷) بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھکو گوارا
اس دشت[1] سے بہتر ہے نہ دلّی نہ بخارا

جس سمت میں چاہے صفتِ سیل رواں چل
وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشہ کو بنا سکتے ہیں خارا[2]

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارا

محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غوّاص
کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا

دیں ہاتھ سے دیکر اگر آزاد ہو ملّت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

دُنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا

اللہ کو پامردیِ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

تقدیر اُمم کیا ہے؛ کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

اخلاصِ عمل مانگ نیاگانِ کہن سے
"شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا!"

(کلیاتِ اُردو صہ ۶۵۷)

---

[1] جنگل [2] سخت پتھر

اقبال کے محبوب الفاظ

ہر شاعر اور ادیب کو اپنے مذاق اور فکر و خیال کے مطابق بعض الفاظ خاص طور پر پسند ہوتے ہیں اور وہ ان الفاظ کا استعمال نسبتاً زیادہ کرتے ہیں۔ اقبال کو بھی بعض الفاظ بہت زیادہ پسند تھے اس لیے انہوں نے ان الفاظ کو اپنے کلام میں بار بار استعمال کیا ہے اور بڑے ذوق و شوق سے کیا ہے۔ ہم یہاں ان کے پسندیدہ الفاظ میں سے کچھ کا حال بیان کرتے ہیں۔

(۱) شاہین :۔

یہ لفظ اقبال کو بہت زیادہ پسند تھا۔ اس کا استعمال انہوں نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں کثرت سے کیا ہے۔ مگر ہم ان کے اس قسم کے کچھ اشعار اور ان کا مطلب لکھتے ہیں تاکہ تم کو معلوم ہو جائے کہ علامہ اس لفظ کو کیوں اتنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

دعا کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔ اس میں فرماتے ہیں :۔

جوانوں کو میری آہِ سحر دے　　پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کے جوانوں کے لیے دعا کرتے ہیں کہ

الٰہی! مسلم جوانوں کو میری آہِ سحر عطا کر تاکہ ان شاہین بچوں کو دوبارہ بال و پر حاصل ہوں تاکہ وہ اپنی پرواز پھر سے جاری رکھ سکیں۔

آہِ سحر صبح جلدی اٹھنے اور خدا کے ساتھ عاجزی و نیازمندی کے تعلق سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے علامہ جوانوں کے لیے صبح جلدی اٹھنے اور عاجزی و نیازمندی کے ساتھ خدا کا ذکر کرنے کی دعا کرتے ہیں تاکہ ان کے اندر بلند پروازی کا

شوق پیدا ہو۔ مسلمان کے اندر بلند مرتبوں پر پہنچنے کا ولولہ خدا کے ساتھ تعلق استوار رکھنے ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

اقبال کو شاہین کی بلند پروازی پسند ہے۔ اس لیے چاہتے ہیں کہ مسلمان نوجوان بھی اپنے اندر بلند عزائم پیدا کر کے بلند مرتبوں پر فائز ہوں۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
مسبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

فرماتے ہیں مجھے اسکول کے کارپردازوں سے شکایت ہے کہ وہ شاہین بچوں (مسلمان نوجوانوں) کو مٹی سے کھیلنے کا سبق پڑھا رہے ہیں یعنی ان کو دینی اور اخلاقی باتوں سے جاہل بنا رہے ہیں تاکہ وہ اپنی زندگی کو دوسری نفسانی خواہشوں کے پورا کرنے تک ہی محدود رکھیں یہی وجہ ہے کہ معاشیات کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے روحانی اور اخلاقی باتوں کے مقابلے میں یہ باتیں ادنیٰ درجے کی ہیں اس لیے ان میں مبتلا رہنے کو اقبال خاک میں کھیلنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور مسلمان نوجوان چونکہ شاہین بچے ہیں اس لیے ان کو خاک میں کھیلنے کی تعلیم دینا ان پر بہت بڑا ظلم ہے۔ ان کو تو دنیا میں سربلند ہونے کے ساتھ ساتھ دینی و اخلاقی بلندیوں پر پہنچنے کی تعلیم دینی چاہیئے کہ یہ بات ان کی فطرت کے عین مطابق ہے۔

تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

فرماتے ہیں: مسلمان شاہین ہے اور شاہین کا کام بلندیوں پر پرواز کرنا ہے، بیکار ہو کر پستی میں پڑا رہنا نہیں ہے۔ بلکہ اس کو تو یہ چاہیئے کہ کسی ایک آسمان (بلند مرتبہ) پر پہنچ جائے تو دوسرے کے لیے کوشش کرے تاکہ ترقی کی رفتار جاری رہے کہ اسی کا نام زندگی ہے۔ تھک کر بیٹھ رہنا یا کسی ایک مقصد کے حاصل ہو جانے پر قناعت کر لینا مسلمان کا کام نہیں ہے۔

شاہین ہر وقت پرواز میں رہتا ہے ۔ اقبال کو اس کی یہ صفت بہت پسند ہے اس لیے چاہتے ہیں کہ قوم کے نوجوان بھی ترقی کی فضاؤں میں پرواز کرتے ہی رہیں ، تھک کر نہ بیٹھیں ۔

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

فرماتے ہیں :۔ اے مسلمان ! جب تو شاہین ہے تو تیرے خیالات بلند کیوں نہیں ہیں تیری آواز تو ایسی ہونی چاہیئے جو مسلمان ہونے کی وجہ سے تیرے لائق ہو ۔ کیونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی شب آسمانوں سے بھی آگے تشریف لے گئے تھے ۔ اس لیے حضورؐ کی امت میں ہونے کی وجہ سے تیری ترقی کی پرواز بھی بہت بلند ہونی چاہیئے ۔

دوسری بات یہ ہے کہ شاہین ہوتے ہوئے تیرے اندر وہ بیباکی بھی نہیں ہے جو شاہین کی صفت ہے ۔ شاہین بہت بیباک ہوتا ہے ۔ بلندی پر اڑتے ہوئے اپنے شکار پر جھپٹتا ہے اور گرنے کا خطرہ بالکل محسوس نہیں کرتا ۔

ترا جوہر ہے نوری ، پاک ہے تو فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور کہ شاہینِ شہ لولاک ہے تو

فرماتے ہیں ، اے مسلمان ! تو شہ لولاک (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کا شاہین ہے اس لیے تیرا جوہر نوری ہے اور تو پاک ہے اور تیرا یہ مرتبہ ہے کہ تو آسمانوں کی آنکھ کا نور ہے ۔ تیری شان یہ ہے کہ فرشتے اور حور کی طرف تو تو نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا کیونکہ تیرا مقصود خدا کی ذات ہے ۔ ایسا شخص دنیا کی معمولی چیزوں کی طرف کیسے مائل ہو سکتا ہے ۔

مسلمان جوانوں سے فرماتے ہیں :۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

مسلمان شاہین ہوتا ہے اور شاہین کسی جگہ آشیانہ نہیں بناتا خواہ شاہی محل کا گنبد ہی کیوں نہ ہو۔ بلکہ آشیانے کے بجائے پہاڑ کی چٹانوں پر بسیرا کر لیتا ہے۔ مسلمان کو بھی بادشاہوں کے قرب پر فخر نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ نہایت سادہ زندگی میں خوش رہنا چاہیئے۔ تاکہ خود داری قائم رہے۔

بچۂ شاہین سے کہتا تھا عقابِ سالخوردہ — اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں کا
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام — سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں
جو کبوتر کے جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر! — وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

ایک بوڑھا عقاب اپنے بچے سے کہہ رہا تھا کہ بیٹے! تو شاہین بچہ ہے، خدا نے تیرے پروں میں اُڑنے کی وہ طاقت رکھی ہے کہ آسمان کی بلندی بھی تیرے لیے کوئی چیز نہیں؛ تو چاہے تو آسمانوں تک پرواز کر سکتا ہے۔ جوانی میں محنت و مشقت کے ذریعے خون کو گرم رکھنا چاہیئے، سخت محنت کی تلخی ہی میں زندگی کی شیرینی پوشیدہ ہے جو محنت و مشقت نہیں کرے گا وہ زندگی کی لذتوں سے محروم رہے گا۔

کبوتر کے گوشت میں وہ مزا نہیں جو کبوتر پر جھپٹنے میں ہوتا ہے۔ کیونکہ مقصد کے حاصل ہو جانے کے بعد عمل کی سرگرمی باقی نہیں رہتی اور زندگی کا لطف کوشش، محنت اور عمل کی سرگرمی سے عبارت ہے۔ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہنے میں نہیں ہے۔

ایک نظم "شاہین" کے عنوان سے لکھی ہے۔ شاہین کہتا ہے:۔

کیا میں نے اُس خاکداں سے کنارا — جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ

میں نے زمیں سے اس لیے تعلق ترک کیا ہے کہ وہاں آب و دانہ کو رزق کہتے ہیں۔ حالانکہ گوشت کا نام رزق ہونا چاہیئے۔ آب و دانہ آسانی سے مل جاتا ہے اور

زمین کی پستی میں ملتا ہے۔ مگر پرندوں کا گوشت بڑی مشکل سے اور وہ بھی فضا کی بلندیوں پر پرواز کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔ پھر گوشت میں جو طاقت و توانائی ہے وہ آب و دانہ میں کہاں ہے! اس لیے کہتا ہے کہ میں نے اس زمین سے اس لیے کنارہ کر لیا ہے کہ یہاں آب و دانہ کو رزق کہتے ہیں اور اسی پر قناعت کر کے خوش ہوتے ہیں۔ بھلا کہاں آب و دانہ اور کہاں ایک تازہ پرندے کا نفیس گوشت اور وہ بھی فضا کی بلندیوں میں پلٹنے جھپٹنے کے بعد اپنی ہی تلاش و کوشش سے حاصل کیا ہوا۔

یہ بلند حوصلگی کے ساتھ اعلیٰ درجے کی چیز کو پسند کرنے کی تعلیم ہے۔

بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ!
نہ بادِ بہاری، نہ گلچیں، نہ بلبل نہ بیمارئ نغمۂ عاشقانہ!

مجھے بیاباں کی خلوت اس لیے پسند ہے کہ خدا نے میری فطرت سب سے الگ رہنے والی بنائی ہے۔ چونکہ بیاباں میں نہ بہار کی ہوا ہے نہ گلچیں ہے، نہ بلبل ہے اور نہ عاشقانہ گانوں کی بیماری ہے، یہ بائیں باغوں میں ہوتی ہیں۔ اس لیے باغوں کی ٹھنڈی اور آرام دینے والی ہوا آدمی کو سست اور کاہل بنا دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں صحرا کی ہوا گرم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحرا کے رہنے والے محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ راحت اور آرام کی زندگی انسان کو بیکار کر دیتی ہے۔

خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ

اس لیے باغ والوں سے دور رہنا اچھا ہے۔ ان کی اداؤں میں بڑی کشش ہوتی ہے اور آدمی ان کی اداؤں پر فریفتہ ہو کر کہیں کا نہیں رہتا۔ مطلب یہ ہے کہ عیش و آرام کی زندگی سب کو عزیز ہوتی ہے مگر یہ زندگی آدمی کو کسی کام کا نہیں چھوڑتی اس لیے آرام و آسائش کی زندگی سے دور رہنا ہی اچھا ہے۔ اس کے مقابلے میں۔

ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری جواں مرد کی ضربت غازیانہ

بیابان کی ہوا آدمی کے خون کو گرم رکھتی ہے۔ اور اس کے اندر ایسی قوت پیدا

کرتی ہے کہ اس کی ضرب غازیوں کی سی کاری ضرب ہو جاتی ہے۔

محنت و مشقت کی زندگی انسان کو شجاع اور دلیر بناتی ہے۔

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

میں جو فاختہ اور کبوتر پر جھپٹتا ہوں تو اس سے یہ نہ سمجھنا کہ میں ان جانوروں کا بھوکا ہوں۔ کیونکہ باز کی زندگی زاہدانہ ہوتی ہے وہ کھانے پینے کی پروا نہیں کرتا۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ان جانوروں پر جھپٹنا خون کے گرم رکھنے کی ایک تدبیر ہے۔ اور جتنا زیادہ جھپٹتا پلٹتا ہوں اتنا ہی خون زیادہ گرم رہتا ہے اور یہ خون کی گرمی ہی میری زندگی ہے۔

مسلمان کو بھی کھانے پینے کے بجائے محنت اور مشقت سے زیادہ دلچسپی ہونی چاہیئے کہ محنت و مشقت ہی کا نام زندگی ہے اور کھانے پینے کا لطف بھی محنت کرنے والے ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

یہ پورب، یہ پچھم، چکوروں کی دنیا مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ

پورب پچھم والی دنیا تو چکوروں کے رہنے کی جگہ ہے۔ کیونکہ ان کی پرواز پست اور محدود ہوتی ہے۔ میری دنیا تو یہ نیلا آسمان ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے یہاں جتنا چاہوں پرواز کر سکتا ہوں۔

اقبال چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی کسی ترقی کو کافی نہ سمجھیں۔ ان کی کوششوں کا میدان غیر محدود ہونا چاہیئے اور ان کے مقاصد میں رفعت بلندی ہونی چاہیئے۔

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ

درویش آزاد ہوتا ہے وہ کسی خاص شہر یا جگہ کا پابند نہیں ہوتا بلکہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ ہر ملک ہمارے خدا کا ملک ہے اس لیے ہمارا ہے اور وہ گھر بنانے کی بھی فکر نہیں کرتا کہ جب اس کا کوئی مخصوص وطن نہیں ہے تو گھر کہاں بنائے؛

مسلمان کی زندگی بھی ایسی ہی آزادانہ ہوتی ہے۔ وہ وطن کی پابند نہیں ہوتی

نہ ہی پر تکلف اور عالی شان مکان کی پابند ہوتی ہے ۔ اس کے پیش نظر تو بڑے بڑے مقاصد ہوتے ہیں اُنہی کی تکمیل سے اُس کو فرصت نہیں ہوتی ۔

---

(۲) "غازی"

غازی، کے معنی ہیں فتح کرنے والا، بہادر سپاہی خصوصاً کفّار کو جنگ کے میدان میں ہلاک کرنے والا ۔ اقبال نے ایک نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے "فاطمہ بنتِ عبداللہ" فاطمہ وہ عرب لڑکی ہے جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی ۔ یہ چودہ سالہ لڑکی اپنے پہلو میں شیروں کا سا دل رکھتی تھی۔ اس نے طرابلس کی جنگ میں، جو ترکی اور اٹلی کے درمیان ہوئی تھی، اپنے ذمے غازیوں کو پانی پلانے کا کام لے لیا تھا اور اپنے کندھے پر مشکیزہ اٹھائے زخمیوں کو پانی پلاتی پھر رہی تھی کہ شہید ہوگئی

اقبال نے یہ نظم لکھ کر فاطمہ بنت عبداللہؓ کو زبردست خراج تحسین ادا کیا ہے اُس نے اس صحرائی لڑکی کی اتنی تعریف اس لیے کی ہے کہ وہ غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی ہے ۔

فرماتے ہیں ۔ اے فاطمہ ! تو ملّتِ اسلامیہ کی آبرو ہے تیرے خاکی جسم کا ذرّہ ذرّہ پاک اور بے گناہ ہے اور یہ سعادت تجھے اس لیے نصیب ہوئی ہے کہ تو نے غازیوں کو پانی پلانے کی خدمت انجام دی ہے ۔

فاطمہ ! تو آبروے امّتِ مرحوم ہے — ذرّہ ذرّہ تیری مشیتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی — غازیانِ دین کی سقّائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر! — ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر!
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی! — ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اقبال نے اپنی مشہور نظم "طلوعِ اسلام" پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر لکھی تھی ۔ اس

نظم میں انہوں نے ترکوں کی شجاعت کی جی کھول کر تعریف کی ہے ۔ اور اس بات پر بڑی خوشی کا اظہار کیا ہے کہ دشمن کی زبردست طاقت کے مقابلے میں ترکوں نے اپنی شجاعت اور سرفروشی کے ایسے کارنامے تاریخ کے صفحات پر لکھے ہیں کہ مسلمان ان پر ہمیشہ فخر کرتے رہیں گے اور اس بات پر بھی ان کو بہت خوشی ہوئی کہ اس جنگ کے نتیجے میں مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ سمجھ گئے کہ کون ان کا دشمن ہے اور کون دوست ۔

اس نظم میں اقبال غازی کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ۔

وہ چشمِ پاک میں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے
نظر آتی ہو جس کو مردِ غازی کی جگر تابی

فرماتے ہیں، گھوڑے کے ساز کی زیب و زینت تو دنیا والے ظاہر بیں لوگ دیکھتے ہیں وہ مسلمان، جس کو اللہ نے دل کی آنکھیں دی ہیں وہ تو مردِ غازی کے ایمان کی حرارت اور اس کا جوشِ جہاد بھی دیکھ لیتے ہیں ۔

ایک نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے " طارق کی دعا " اس نظم میں انہوں نے غازیوں کی تعریف انتہائی جوش کے ساتھ کی ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے — جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو — عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن — نہ مالِ غنیمت ، نہ کشور کشائی

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیئے اس کو خونِ عرب سے

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا — خبر میں ، نظر میں ، اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو — وہ سوز اس نے پایا انہیں کے جگر میں
کُشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو — ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

رمضان ۹۲ھ (اپریل ۷۱۱ء) میں موسیٰ بن نصیر والیٔ افریقہ نے اپنے نامور سردار طارق بن زیاد کو اسپین پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔ چنانچہ طارق نے آبنائے کو عبور کر کے ایک پہاڑی پر قیام کیا جو آج کل جبل طارق یا جبرالٹر کے نام سے مشہور ہے۔ طارق رمضان ۹۲ھ میں دریائے لکہ کے کنارے راڈرک شاہِ اسپین کی ایک لاکھ فوج سے معرکہ آرا ہوا۔

اقبال نے طارق اور اس کے ساتھیوں کو "پراسرار بندے" اس لیے کہا ہے کہ جب طارق اپنی فوج کے ساتھ اندرون ملک کی طرف بڑھا تو اتفاق سے راڈرک کا ایک صوبہ دار اس نواح میں موجود تھا۔ وہ طارق کے مقابلے کے لیے نکل آیا لیکن طارق نے اُسے شکست فاش دے دی۔ صوبہ دار اس قدر خوف زدہ ہوا کہ اس نے راڈرک کو ان الفاظ میں اس واقعہ کی اطلاع دی کہ "ہمارے ملک پر ایسے لوگوں نے حملہ کیا ہے کہ نہ ان کا وطن معلوم ہے نہ اصلیت کہ وہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں، زمین سے نکلے ہیں یا آسمان سے اُتر پڑے ہیں۔

نظم کا مطلب یہ ہے کہ:-

الٰہی! یہ غازی، جن کی بے مثال شجاعت اور سرفروشی کو دیکھ کر دشمن ان کو "پراسرار" کہتے ہیں، جنہیں تو نے حکمرانی کا ذوق عطا کیا ہے، جن کے گھوڑوں کی ٹھوکر سے دریا اور صحرا کائی کی طرح چھٹ جاتے ہیں جن کی ہیبت سے پہاڑ سمٹ کر رائی بن جاتے ہیں، یہ اس وقت اپنے وطن سے دُور تیرے نام کو بلند کرنے کی غرض سے اجنبی ملک میں آئے ہیں، جہاں ان کا کوئی دوست اور مددگار نہیں۔

محبت کی لذّت بھی کیسی عجیب شے ہے! یہ مسلمان، جن کو دونوں جہانوں کی پروا نہیں

ان کے پیش نظر نہ مالِ غنیمت ہے نہ ملک گیری ۔ بلکہ ان کا مقصود تیری راہ میں لڑکر شہید ہوجانا ہے ۔ یہ تیری محبت کے نشے میں سرشار ہیں ۔

اے خدا ! تو نے عربوں کو جو اسلام سے پہلے صحرائی تھے ، عشق اور جہاد جیسی نعمتوں سے نواز کر دنیا کی قوموں میں یکتا بنا دیا ۔ انسان کی زندگی جس سوز و گداز کی صدیوں سے طلبگار تھی وہ اُسے اُنہیں عربوں کی بدولت حاصل ہوا ۔ یہ عرب جذبۂ محبت میں ایسے سرشار ہیں کہ موت کو ہلاکت نہیں بلکہ مقصد کے حاصل ہونے کا ذریعہ سمجھتے ہیں ۔

اے خدا ! ان غازیوں کے دل میں پھر وہی جذبۂ جہاد پیدا کر دے جو ان کے اسلاف میں تھا تاکہ یہ تیری زمین پر کسی کافر کو زندہ نہ رہنے دیں ۔

خدایا ! مسلمانوں کے دلوں میں پھر عزائم کو بیدار کر دے اور ان کی نگاہوں کو تلوار بنا دے یعنی ان میں ایسا رعب پیدا کر دے کہ کافر ان کو دیکھ کر ہی لرزہ براندام ہو جائیں ۔

---

(۳) مومن

مومن کی عام تعریف تو یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے تمام صفات فرشتوں ، آسمانی کتابوں اور پیغمبروں کو دل سے مانے اور جو باتیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے لائے ہیں ان سب کو سچا جانے اور زبان سے ان کا اقرار کرے وہ مومن ہے ۔ مگر اقبال نے اس لفظ میں اس قدر معنی پیدا کیے ہیں کہ ان کی وسعتوں کی کوئی حد نہیں رہی ۔ اور ان معنوں میں اپنے بیان کی اثر انگیزی و دلکشی کے باعث بڑی کشش پیدا کر دی ہے ۔ مثلاً

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن !

مومن دوستوں کی صحبت میں ریشم کی طرح نرم اور حق و باطل کی جنگ میں فولاد کی طرح سخت ہوتا ہے ۔

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش　　خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

مومن خاکی ہوتے ہوئے، خاک سے آزاد ہوتا ہے یعنی ادنیٰ درجے کی مادّی خواہشوں میں گرفتار نہیں ہوتا۔

جچتے نہیں کنجشک و حمام اُس کی نظر میں　　جبریل و سرافیل کا صیّاد ہے مومن

مومن اپنی نظر میں بلند مقاصد رکھتا ہے اس لیے معمولی چیزوں کی طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہیں رکھتا۔

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن　　حوروں کو شکایت ہے، کم آمیز ہے مومن!

مومن کی ایمانی و اخلاقی خوبیاں ایسی دلکش ہوتی ہیں کہ فرشتے بھی اس کی تعریف کرتے ہیں اور اپنی خوبیوں کی وجہ سے اس میں اس قدر بے نیازی کی شان پیدا ہو جاتی ہے کہ حوروں کی طرف بھی مائل نہیں ہوتا۔ حوروں کے اس کے کم کم ملنے کی شکایت رہتی ہے۔

قہّاری و غفّاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

جس طرح انسان چار عناصر، پانی، ہوا، خاک اور آگ سے بنا ہے اسی طرح مومن چار عناصر، قہّاری و غفّاری و قدّوسی و جبروت سے بنتا ہے۔

قہّاری: کفر و باطل کو مٹانا اور اسلام کے دشمنوں کو دفع کرنا۔

غفّاری: لوگوں کی خطاؤں کو بہت زیادہ معاف کرنا۔

قدّوسی۔ انتہائے پاکیزگی و طہارت۔

جبروت: شان و شوکت۔

ہمسایہ جبریلِ امیں بندۂ خاکی　　ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں

مومن، خاکی ہوتے ہوئے اپنے پاکیزہ اور بلند مقاصد کی وجہ سے جبریلِ امیں کا ہمسایہ (ہم پلہ) ہوتا ہے اور اس کی ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ کسی خاص جگہ اور مقام میں محدود نہیں ہوتا۔ بلکہ ساری دنیا اس کا وطن ہوتی ہے اور دنیا کے تمام مسلمان

اُس کے ہم وطن اور بھائی ہوتے ہیں ۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن

مومن ، ظاہر میں قاری (قرآن پڑھنے والا) نظر آتا ہے ورنہ حقیقت میں وہ قرآن ہے اور یہ راز کسی کو معلوم نہیں ہے ۔ قرآن وہ ان معنوں میں ہے کہ اس کے ایک ایک عمل سے قرآن کی شان عیاں ہوتی ہے دیکھنے والے کو اس کے اعمال و کردار دیکھ کر قرآن سمجھ میں آتا چلا جاتا ہے کیونکہ اس کا ہر عمل قرآن کے عین مطابق ہوتا ہے ۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں، وہ طوفاں

دوستی کی صورت میں مومن، ایسا ٹھنڈا ہوتا ہے کہ اس کی ٹھنڈک شبنم کی طرح لالے کے جگر میں بھی ٹھنڈک پیدا کر دیتی ہے اور قہر و غضب کی حالت میں ایسا طوفان ہوتا ہے کہ جس سے دریاؤں کے دل بھی دہل جاتے ہیں ؛ بڑے بڑے جابر اور ظالم بادشاہ بھی اس کے خوف سے کانپنے لگتے ہیں ۔

فطرت کے سرودِ ازلی اُس کے شب و روز آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن

مومن کی زندگی میں فطرت کے نغموں کی سی دلکشی ہوتی ہے اور اس کے کاموں میں ایسی ہم آہنگی (موزونیت) ہوتی ہے جیسی سورہ رحمٰن کی آیتوں میں ۔

عالَم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہا گیا ہے کہ اگر آپؐ نہ ہوتے تو آسمان و زمین بھی نہ ہوتے ۔ اس سے ثابت ہوا کہ عالَم کو حضورؐ کی خاطر پیدا کیا گیا ہے اور مومن چونکہ وارثِ رسولؐ ہے اس لیے اس کو اس عالم کا بھی وارث ہونا چاہیے مگر یہ عالم عیش و آرام میں مبتلا مومن کا نہیں ، جانباز مومن کا ہے جو اس کو جہاد کر کے کفّار کے قبضے سے چھینتا ہے ۔ کیونکہ اس کی میراث پر کفّار محض اُس کی غفلت کی وجہ قابض ہو گئے ہیں ۔

کافر ہے مسلماں ، تو نہ شاہی نہ فقیری مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

اگر مسلمان نام کا ہے اور کام کافروں کے سے کرتا ہے تو اس کی قسمت میں نہ فقیری ہے نہ شاہی اور اگر واقعی مسلمان ہے تو فقیری میں بھی بادشاہی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر صرف حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی پڑھ لینے بھی کافی ہیں۔ کہ بادشاہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش کرتے ہیں اور وہ ان کو اپنی خدمت میں حاضر ہونے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ　　مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اگر سپاہی کافر ہے تو وہ تلوار پر بھروسہ کرتا ہے کیونکہ کافر خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس لیے وہ مادّی دنیوی سہاروں اور وسیلوں کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا لیکن اگر سپاہی مومن ہے تو وہ بغیر تلوار کے بھی لڑتا ہے کیونکہ اس کو مادّی سہاروں ہی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا خدا پر بھی ایمان ہوتا ہے کہ وہ بغیر کسی ظاہری سبب کے بھی سب کچھ کر سکتا ہے۔

---

(۴) زندگی

زندگی کا لفظ اب تک جن معنوں میں بولا جاتا رہا وہ نہایت محدود تھے۔ اقبال نے زندگی کے معنوں میں اس قدر وسعت پیدا کی کہ اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں ملتی۔ ہم مثال کے طور پر کچھ اشعار نقل کرتے ہیں ورنہ اس کے مختلف معنی کے استعمال سے اقبال کا اُردو اور فارسی کلام بھرا ہوا ہے۔

نظم "بچے کی دعا" میں زندگی کی یہ تعریف کی ہے کہ شمع کی طرح دوسروں کے کام آنا اور پروانوں کی طرح علم کی شمع سے محبت کرنا "زندگی" ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری　　زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب　　علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

نظم "چاند تارے" میں زندگی کی یہ تعریف کی ہے کہ حرکت میں زندگی ہے۔

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

نظم "عاشق ہرجائی" میں زندگی کی یہ تعریف کی ہے کہ زندگی محبت کا درد اور دُکھ سہنے اور اُف نہ کرنے کا نام ہے۔ اس لیے میں اپنے دوست کی دغا سے بے نیاز ہوں اور اس کی جفاؤں کو پسند کرتا ہوں۔

زندگی الفت کی درد انجامیوں سے ہے مری
عشق کو آزادِ دستورِ وفا رکھتا ہوں میں

نظم "گورستانِ شاہی" میں چہل پہل اور شور وغوغا کو زندگی کہا ہے اور خاموشی کے سناٹے کو موت۔ ؎

زندگی سے تھا کبھی معمور، اب سنسان ہے یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے

ایک نظم جس کا عنوان ہے "فلسفۂ غم" اس میں زندگی کی یہ تعریف کی ہے کہ زندگی جہاں عیش وعشرت رکھتی ہے وہیں اپنے اندر درد وغم بھی رکھتی ہے ؎

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی

اسی نظم میں فرماتے ہیں، جس شخص کی شام نالۂ "یارب" سے واقف نہ ہو (درد اور تکلیف کی حالت میں آدمی: یارب! یارب کرتا رہتا ہے) جس کی رات میں آنسوؤں کے تارے نہ ہوں (رات کے وقت روتا نہ ہو) جس کا دل غم سے شکستہ نہ ہوا ہو اور جو ہمیشہ عیش وعشرت ہی میں رہتا ہو اور جس کا عشق جدائی کے آزار سے واقف نہ ہو، ایسا شخص گو دکھ درد سے دور ہے لیکن زندگی کے راز سے

ناواقف ہے ۔ کیونکہ زندگی رنج و غم سہنے اور دکھ درد برداشت کرنے ہی میں پنہاں ہے

شام جس کی آشنائے نالۂ "یارب" نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں
جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے ناآشنا
جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا
ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظِ نوکِ خار سے
عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے
کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

اس نظم میں زندگی کی یہ بھی تعریف کی ہے کہ وہ ایسی نہر ہے جو ہمیشہ جاری رہے گی۔ زندگی اگرچہ ایک ہے لیکن یہ کثرت اس طرح بن گئی جیسے کوئی دریا پہاڑ کی بلندیوں سے نکل کر بہت سی نہروں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور وہ نہریں رواں دواں پھر سمندر میں جا گرتی ہیں اور ایک ہو جاتی ہیں ۔ اسی طرح انسان بھی موت کے ہاتھوں ایک دوسرے سے جُدا ہوتے ہیں تاہم یہ جدائی عارضی ہے اس لیے کہ ایک دن سب کے سب حشر کے میدان میں ایک جگہ جمع ہو جائیں گے ۔

ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی
پستیِ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

علامہ نے ایک نظم "چاند" کے عنوان سے لکھی ہے ۔ اس میں فرماتے ہیں ۔ خدا تاروں کی خاموشی میں نہیں ملے گا ۔ خُدا کو زندگی کے ہنگاموں میں تلاش کرنا چاہیے ۔

تو ڈھونڈتا ہے جس کو تاروں کی خامشی میں
پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں

ایک جگہ فرماتے ہیں، زندگی کا راز قطرے سے سیکھنا چاہیئے کہ کبھی موتی، کبھی شبنم اور کبھی آنسو کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے وہ کبھی ایک حال پر نہیں رہتا کہ ایک حال پر رہنا زندگی نہیں ہے ؎

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

ایک جگہ فرماتے ہیں، پہلو میں دل ہونا چاہیئے، بغیر دل کے "زندگی" نہیں ہے، مگر دل سے یہ گوشت کا ٹکڑا مُراد نہیں ہے جو انسان کے بائیں پہلو میں ہوتا ہے. بلکہ وہ چیز مُراد ہے جس کی موجودگی کی وجہ سے اللہ کے خاص بندے، "اہلِ دِل" کہلاتے ہیں ؎

پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا

ایک نظم کا عنوان ہے "شفاخانۂ حجاز" اس میں زندگی کی یہ تعریف کی ہے کہ حجاز کے راستے میں تو مرنا زندگی ہے۔ یہاں شفاخانہ قائم کرنا اچھا نہیں۔ عاشق کی جو بات موت کی تلخی میں حاصل ہوتی ہے وہ خضرؑ کو اپنی عمرِ دراز میں بھی میسر نہیں ؎

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات — پوشیدہ جس طرح ہے حقیقت مجاز میں
تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مِل گیا — پایا نہ خضرؑ نے مئے عمرِ دراز میں

ایک جگہ حرکت، دوڑ دھوپ اور چہل پہل کو زندگی قرار دیتے ہیں

چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغامِ حیات
باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرامِ حیات
مسلم خوابیدہ اُٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ چمک اُٹھا اُفق ، گرمِ تقاضا تو بھی ہو

ایک شعر میں انسان کے روزمرّہ کے احوال کو زندگی کہا ہے ؎

خوب ہے تجھ کو شعارِ صاحبِ یثرب کا پاس کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مُسلم نہیں

"زندگی" کی یہ بھی تعریف کی ہے ؎

نَے مجالِ شکوہ ہے نَے طاقتِ گفتار ہے زندگانی کیا ہے ، اِک طوقِ گلو افشار ہے

نہ شکوہ شکایت کرنے کی مجال ہے نہ بولنے کی طاقت ہے بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے یہ تو گلا گھونٹنے والا پھندہ ہے !

یہ غلامی کی زندگی ہے ، جس میں آدمی اپنا دکھ درد بھی بیان نہیں کر سکتا۔ ایسی زندگی کو ، طوقِ گلو افشار ، گلے کو دبانے والا طوق کہنا کس قدر صحیح مثال ہے ۔

"زندگی" فنا ہونے والی چیز نہیں ہے علامہ نے اس حقیقت کو اس طرح ادا کیا ہے کہ زندگی کی آگ کا انجام راکھ ہو جانا نہیں ہے اور نہ ہی وہ ایسا موتی ہے جو ٹوٹ جائے

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں ٹوٹنا جس کا مقدر ہو ، یہ وہ گوہر نہیں

ایک جگہ فرماتے ہیں ، "زندگی" قدرت کو اس قدر محبوب ہے کہ اُس نے اس کی حفاظت کا ذوق ہر چیز میں رکھ دیا ہے ؟ ہر چیز اپنی زندگی کی حفاظت خود کرتی ہے ۔

اگر زندگی کا نقش موت کے ہاتھوں مٹ سکتا تو قدرت موت کو اس طرح عام نہ کرتی ۔ موت اس قدر عام ہے تو سمجھ لو ، موت کچھ نہیں ؟ موت کا عام ہونا ہی اس کے

بے اثر ہونے کی دلیل ہے ۔ موت کی مثال خواب کی سی ہے ۔ جس طرح سونے سے زندگی میں خلل نہیں پڑتا اسی طرح موت بھی زندگی میں خلل انداز نہیں ہو سکتی ؎

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

"زندگی" اس دنیا تک ہی محدود نہیں ہے ، آخرت میں بھی جاری ہے البتہ آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی سے بالکل مختلف ہے ؎

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے
کوشش ، محنت اور جفاکشی میں زندگی کی آبرو ہے ؎
تمنا آبرو کی ہے اگر گلزارِ ہستی میں تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

موت زندگی کے ختم ہو جانے کا نام نہیں ۔ بلکہ اس عارضی زندگی کے بدلے میں ہمیشہ رہنے والی زندگی ملتی ہے ۔

موت کو سمجھا ہے غافل اختتامِ زندگی ہے یہ شامِ زندگی ، صبحِ دوامِ زندگی

نظم "خضرِ راہ" میں کہتے ہیں ، میں نے خضر سے پوچھا کہ ہمیشہ سفر میں رہنے سے اُسے کیا حاصل ہوتا ہے ۔ خضر نے فرمایا کہ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کیونکہ مسلسل سفر میں رہنا ہی اصل زندگی ہے ؎

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے یہ تگاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

مسلسل مشکلات اور پریشانیوں کا مقابلہ کرتے رہنے سے "زندگی" اور زیادہ پختہ ہوتی ہے۔ زندگی کی پختگی کا راز اسی میں ہے کہ انسان پریشانیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا رہے ؎

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

"زندگی" کو امروز و فردا کے پیمانے سے ناپنا غلطی ہے۔ کیونکہ زندگی ہمیشہ رہنے والی مسلسل دوڑنے والی اور ہر دم جواں رہنے والی شے ہے اور امروز و فردا عارضی اور ناپائیدار ہیں ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

دوسروں کی بنائی ہوئی دنیا میں رہنا زندگی نہیں ہے۔ زندگی اپنی دنیا آپ بنانے کا نام ہے ؎

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے سرِّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کو زندگی قرار دیا ہے اور اس کی تائید میں دو حقیقتیں پیش کی ہیں۔ ایک یہ کہ آدم جب دنیا میں آئے تو انہوں نے اپنے جملہ امور خود ہی انجام دیئے۔ ان کو بنی بنائی دنیا (ضرورت کی چیزیں) نہیں ملی تھی۔ پس تم بھی اولادِ آدم ہو۔ تم کو بھی اپنے کام کسی دوسرے کے سہارے کے بغیر خود ہی کرنے چاہئیں اور اس طرح اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دینا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ خدا جو حیّ و قیوم ہے اس نے اپنی یہ دنیا (جہاں آب و گل) بغیر کسی دوسرے کے تعاون کے خود ہی پیدا کی۔ لفظ کُن فرمایا اور یہ کائنات وجود میں آگئی۔ اگر خدا نہ کہتا تو یہ عالم کیسے وجود میں آتا۔ اسی طرح تم بھی اگر محنت مشقت نہیں کرو گے تو کام کیسے ہوں گے۔ اپنے کام خود کرو اور اپنی زندگی کا ثبوت دو۔ دوسروں کے سہارے پر رہنا زندگی نہیں ہے۔

ضمیرِ کُن فکاں = کن فکاں کا راز (کن = ہو جا۔ فکاں = پس ہو گیا۔)

زندگی کی شکلیں مختلف ہیں۔ کوہکن سے پوچھیے تو کہے گا کہ دودھ کی نہر۔ بسولا یعنی تیشا اور بھاری پتھر، زندگی ہے کیونکہ کوہکن کا مقصد شیریں تھی اور شیریں کے ملنے کی شرط یہ تھی کہ وہ پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لائے۔

شیریں ایک حسینہ تھی جو حسن و جمال کے اعتبار سے تمام فارس میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ خسرو پرویز نے اس کی تعریف سنی تو اس کو دیکھنے کی غرض سے گیا اور دیکھتے ہی اس پر عاشق ہوگیا۔ شیریں نے اس سے شادی کر لی۔ شیریں کے محل کے پاس ایک پُر فضا پہاڑ تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ اس پہاڑ سے محل تک ایک نہر نکالی جائے۔ اس زمانے میں فرہاد نامی سنگ تراش اس کام میں بہت ماہر تھا، کہنا چاہیے انجینیر تھا۔ اس کو دربار میں طلب کیا گیا۔ وہ آیا اور جونہی اس کی نظر شیریں پر پڑی، ہزار جان سے اس پر عاشق ہوگیا۔ حسب منشا نہایت عمدہ نہر نکالی مگر سوائے شیریں کے اور کوئی صلہ نہ چاہا۔ خسرو نے یہ شرط رکھی کہ اگر تم کوہِ بیستون کو کاٹ کر صاف کر دو گے تو شیریں تم کو مل جائے گی جذبۂ عشق میں شبانہ روز محنت کر کے تھوڑے عرصے میں تمام پہاڑ کاٹ ڈالا۔ جب بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے ایک بہروپیے کو بھیجا .... جس نے فرہاد کو بتایا کہ شیریں کا انتقال ہوگیا ہے یہ سنتے ہی فرہاد کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور اس نے اپنے سر پر وہی تیشہ مار لیا اور جاں بحق ہوگیا۔

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے، زندگی

زندگی غلامی میں کم ہو کر "جوئے کم آب" رہ جاتی ہے اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہوتی ہے۔ غلامی میں کم اس لیے ہو جاتی ہے کہ غلام کی صلاحیتوں اور خداداد قوتوں پر پابندی لگی ہوتی ہے اس لیے وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ بس کھانے پینے، پہننے اور رہنے کی حد تک اس کی ضروریات اس کے آقا کی طرف سے پوری کر دی جاتی ہیں اور آقا اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے اس سے کام لیتا ہے۔ اس کے برخلاف آزاد کی تمام قوتیں اور،

صلاحتیں آزاد اور اس کے اپنے اختیار میں ہوتی ہیں ۔ اس لیے اس پر ترقی کے تمام راستے کھلے ہوتے ہیں اور یوں اس کے فکر و عمل کی جولانیوں کا میدان بہت زیادہ وسیع ہوتا ہے ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

زندگی کو ہمیشگی، مضبوط ایمان کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اور اس کی دلیل میں یہ بات پیش کی ہے کہ ترک، چونکہ ایمان محکم کے مالک تھے اس لیے جرمنوں کے مقابلے میں زیادہ پائدار ثابت ہوئے ؎

ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دُنیا میں
کہ المانی سے بھی پایندہ تر نکلا ہے تورانی

انسان مٹی کا ایک پیکر ہے اور اس پیکر میں "زندگی" رکھ دی گئی ہے ۔ مگر یہ زندگی ظاہر اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنی کوششوں سے نئی نئی فتوحات حاصل کرتا ہے ۔ ورنہ زندگی اس کے اندر اسی طرح پوشیدہ رہتی ہے جس طرح آگ پتھر میں پوشیدہ رہتی ہے ؎

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

زندگی کے میدان مختلف ہیں تو ہر میدان میں اس کا استعمال بھی مختلف ہونا چاہیے یہ نہ ہو کہ دشمنوں میں نرم خوئی اختیار کی جائے اور دوستوں میں بدمزاجی اور سختی ؎

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تُندرو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ایک جگہ انساں کو زندگی کہا ہے اور انسان کے علاوہ جو کچھ اس دنیا میں ہے اس کو کھیل کود قرار دیا ہے ؎

تو زندگی ہے ، پائندگی ہے باقی ہے جو کچھ سب خاکبازی

زندگی کا سمندر برابر جاری ہے اور ہر شے سے زندگی کی رواداری اور دوڑ دھوپ کا اظہار ہو رہا ہے ؎

دما دم رواں ہے یمِ زندگی ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

کہیں شاہین ہے جس کے پنجے چکوروں کے خون سے رنگین ہیں ، کہیں کبوتر ہے جو اپنے آشیانے سے دُور جال میں گرفتار ہے اور پھڑ پھڑا رہا ہے ۔ یہ سب زندگی ہی کے آثار ہیں ؎

کہیں جُرّہ شاہین سیماب رنگ لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ
کبوتر کہیں آشیانے سے دُور پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

"زندگی" کو اُلجھ کر سُلجھنے میں لذّت حاصل ہوتی ہے ۔ کیونکہ اُلجھنے کی صورت میں سُلجھانے پر محنت کرنی پڑتی ہے اور محنت ہی میں زندگی کا لطف ہوتا ہے ؎

اُلجھ کر سُلجھنے میں لذّت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے

1346